Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1970

۶ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان

اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی

قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

سالانہ — پاکستان — دس روپے

سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے

سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان — ایک روپیہ

ہندوستان — ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

جلد (۲۳) — ستمبر ۱۹۷۰ء — نمبر (۹)

فہرست

(۱) لمعات — ۳

(۲) یہ آئینہ ہے! — ۱۲

(۳) ہم کس کا ساتھ دیں؟ — ۳۳

(۴) یومِ آزادی کی روح پرور تقریب — ۳۹

(۵) عورتوں کے اسلامی حقوق اور تعددِ ازواج — (شاہد عادل) — ۴۱

(۶) جنسی پابندیوں کا اثر قوموں کی زندگی پر — (محترم پرویز صاحب) — ۵۲

(۷) تعلیم کا نصاب نَو — (محترم عبدالحکیم خان صاحب مرحوم) — ۷۳

ایڈیٹر: محمد طفیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت: ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

یاد میں

(۱) پاکستان کی سرحدوں پر بسنے والے ان بے گناہ، مظلوم انسانوں کی جنہیں بھارتی درندوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بغیر کسی قسم کی آگہی یا اعلانِ جنگ کے اُس وقت اپنی ہوسِ خون آشامی کا شکار بنایا جب وہ آرام سے اپنے گھروں میں سو رہے تھے اور ستاروں کی آنکھوں کے سوا، اس خونی منظر کا دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

(۲) اُن معصوم بچوں کی جنہیں مرہٹہ "بلوانوں" اور سکھ "سورماؤں" نے اچھال اچھال کر اپنی سنگینوں کی نوکوں سے چھلنی کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم کیوں لیا تھا۔

(۳) اُن عزت مآب دخترانِ ملّت کی جنہیں یہ انسان نما بھیڑیئے، ان کے صحنِ خانہ سے ان نامعلوم ویرانوں کی طرف کشاں کشاں لے گئے جہاں سے پھر ان کی آہ و فغاں تک بھی کسی کو سنائی نہ دی۔

(۴) اور — یاد میں

اُن غیور و جسور جوانانِ ملّت کی جو ان بے پناہ مظالم کا بدلہ لینے کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آنکلے اور اپنی عدیم النظیر جرأت و بسالت سے دنیا کو دکھا دیا کہ حق کی خاطر جان دینے والے کیا کچھ کر دکھایا کرتے ہیں۔

اور — چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ، چونڈہ، واہگہ، برکی، ہڈیارہ، سلیمانکی، راجستھان کے میدانوں کے ان ذرّات کی جو اپنی عالمتاب چمک دمک سے اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ خونِ شہداء کی رنگینی کس طرح حنا بندِ عروسِ ملت ہوتی ہے۔

لاکھوں صلوٰۃ و سلام ہوں اُن شہدائے امّت اور مجاہدینِ ملّت پر جنہوں نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے اس خطۂ زمین کو دشمن کی دستبرد سے محفوظ رکھا جسے اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ ؎

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما سازگار آمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

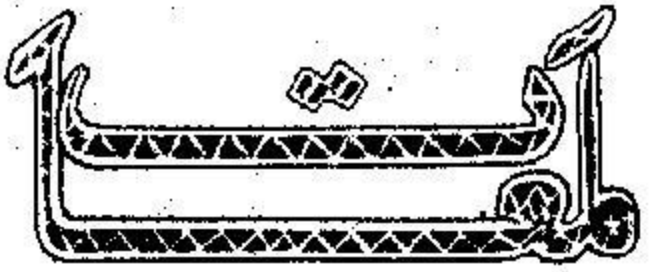

الم انگیز ہونے پر بھی کیا دلچسپ ہوتا ہے
چراغِ انجمن کا ذکر، پروانے کا افسانہ

سرسیدؒ نے آج سے قریب سو سال پہلے، اپنے انگریز کلکٹر سے کہا تھا کہ آپ لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں، کہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے۔ یہاں دو الگ الگ قومیں بستی ہیں۔ اگر آج کوئی اس حقیقت سے اغماض برتتا ہے تو آنے والا زمانہ اس سے اس حقیقت کو خود منوا لیگا۔ سرسیدؒ نے یہ اعلان، ہندوستان کی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) سے چند ہی سال بعد کیا تھا، جب حالت یہ تھی کہ انگریز اور ہندو کی متحدہ سازش، ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹانے کے لئے برسرِ کار تھی۔ سرسیدؒ کے اس انقلابی اعلان سے ان کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے متحدہ قومیت کا جال بننے کے لئے گہری تدبیریں سوچنی شروع کر دیں۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام اسی سازش کی ایک کڑی تھا۔ سرسیدؒ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ ہندو اور انگریز کے تیار کردہ اس دامِ ہمرنگِ زمیں میں نہ پھنسیں اور اس کانگریس میں قطعاً شامل نہ ہوں جو ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم کے افراد قرار دے کر اپنے آپ کو نیشنل کہتی ہے۔ اس کے بعد جب ہندوستانیوں کو شریکِ حکومت کرنے کی اصلاحات کا پہلا قدم اٹھایا گیا تو سرسیدؒ نے انگریز سے برملا کہہ دیا کہ جب تک مسلمانوں کو جداگانہ نیابت نہیں دی جائے گی، ہم اس میں شرکت نہیں کرینگے۔ سرسیدؒ کے بعد اقبالؒ بھی اسی پیغام کو دہراتا رہا، کہ ــــ بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ــــ اور ہندو، اس کے خلاف متحدہ قومیت کا راگ الاپتا رہا، تاآنکہ ۱۹۳۰ء میں اقبالؒ نے اس نظری تصور کو عملی پیکر میں تبدیل کرنے کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ قوم کے لئے ایک جداگانہ خطۂ زمین کے مطالبہ کی بنیاد رکھی۔ قائداعظمؒ اس بنیاد پر تشکیلِ پاکستان کی عمارت

استوار کرتے چلے گئے، اور جب ان سے دریافت کیا گیا کہ پاکستان کب وجود میں آئے گا، تو انہوں نے کہا کہ پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جس دن یہاں سب سے پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کر کے، اپنی جداگانہ قومیت کا اعلان کیا تھا۔ بات آگے بڑھتی گئی تا آنکہ ہندو اور انگریز دونوں کو، مسلمانوں کے اس متحدہ مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا، اور ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے لئے خطۂ زمین الگ کر دیا گیا اور اس طرح ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی۔ یوں تو یہ تقسیم، انگریز، ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ معاہدہ کی رو سے عمل میں آئی تھی، لیکن ہندو اور انگریز دونوں کے دل پر اس سے کیا گزری تھی، اس کا اندازہ ان کے اعلانات سے لگائیے جس سے انہوں نے اس معاہدہ کی رسمِ افتتاحیہ ادا کی تھی۔ یہ معاہدہ، مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین ہوا تھا۔ ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۱۴ رجون کو حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو ایک طرف اس معاہدہ پر دستخط کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہا تھا کہ

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر اور دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنے کے بل جھک کر ہم سے درخواست کرے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

یہ نیشنلسٹوں کے نیتا تھے۔ ہندو مہاسبھا کے سرپنچ، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، اپنی جاتی کو یہ تلقین کر رہے تھے کہ

> ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے، اس حقیقت سے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔

یہ ہندوؤں کی متشدد جماعت کا نمائندہ تھا۔ دوسری طرف دیوان چمن لال جیسا (بظاہر) اعتدال پسند لیڈر یہ کہہ رہا تھا کہ

> میں نا امید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک

> عارضی حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم انہیں امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوتے ہیں۔

یہ ہندو تھا۔ دوسری طرف انگریز کی کیفیت یہ تھی کہ جب تقسیم ہند کا بل، پارلیمان میں منظوری کے لئے پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیر اعظم، لارڈ ایٹلی نے (جو اس وقت میجر ایٹلی تھے) اپنی تقریر میں کہا کہ

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکیگی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

اس طرح، ہندو اور انگریز کی طرف سے اس اسکیم کا مہورت (افتتاح) یا سواگت (استقبال) ہوا۔ ہندو اور انگریز کے ان مشئوم عزائم کا مظاہرہ خود تقسیم کے وقت ہوا جب انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اور لاکھوں کی تعداد میں بے سروسامان قافلوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد ــ دم لیا تھا نہ قیامت میں ہنوز ــ کہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہندوؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن خود انہی کی بعض مصلحتوں کی بنا پر یہ منصوبہ عمل میں نہ آسکا۔ نرادسی۔ چوہدری کے بیان کے مطابق ہندوؤں نے دو سال کے عرصہ میں تین بار پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاری کی تھی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ راجہ مہندر پرتاپ نے سنہ ۱۹۵۰ء میں کہا تھا کہ

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لازمی ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

ہندو حملہ تو نہ کرسکا لیکن حملے کی تیاری سے ایک ثانیہ کے لئے بھی غافل نہ رہا۔

(۰)

اُدھر یہ ہو رہا تھا اور اِدھر (پاکستان میں) قوم ہندو کے "مالِ غنیمت" کی لوٹ میں مصروف تھی۔ جس فرد، گروہ، یا قوم کو لوٹ کا چسکا پڑ جائے وہ محنت کر کے کمانے کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ لوٹ کا مال ختم ہو گیا تو

بجائے اس کے کہ قوم محنت شروع کرتی، اس نے لوٹ ہی کی نئی نئی راہیں تراشنا شروع کر دیں۔ اور اس کے لئے اس نے ایسے سہل گزار راستے وضع کئے کہ ____ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا ہو ____ چنانچہ قوم پھر لوٹ میں منہمک ہو گئی۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے، ہندو کے ترکہ کو لوٹا جا رہا تھا۔ اب قوم خود اپنوں کو لوٹ رہی تھی۔ ترقی (DEVELOPMENT) کے لئے یہاں صنعت کا دور شروع ہوا تو سرمایہ داروں کے وارے نیارے ہو گئے۔ جس نے چکی سے بات شروع کی، دنوں میں ملوں کا مالک بن گیا۔ مزید ترقی ہوئی تو تجارت کو فروغ حاصل ہو گیا۔ جس کی باپ دادا کے وقت سے آٹے دال کی دکان چلی آ رہی تھی، وہ چیمبر آف کامرس کی باتیں کرنے لگ گیا صنعت اور تجارت کے لئے سرکاری امداد کی ضرورت تھی۔ اس امداد کی آڑ میں نظم و نسق کی ساری مشینری (CORRUPT) ہو گئی۔ رفتہ رفتہ قوم دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی ____ ایک طبقہ لوٹنے والوں کا، دوسرا لٹنے والوں کا ____ ملک کی ترقی کا پیمانہ، لوٹنے والوں کے چہروں کی سرخی قرار پا گیا۔ اور کسی نے نہ سوچا کہ اس ایک کے چہرے کی سرخی سے کتنے ہزار چہروں کی سرخی زردی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ بہر حال، جب ترقی کا پیمانہ لوٹنے والوں کا معیار زیست قرار پا گیا تو ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ملک کی دولت بڑھ رہی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کتا، کسی خشک ہڈی کو چبانے لگتا ہے تو ہڈی کی نوک سے اس کا جبڑا زخمی ہو جاتا ہے اور اس میں سے لہو رسنے لگتا ہے۔ وہ کتا اس لہو کو مزے لے لے کر چوستا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اسے نہایت تر و تازہ غذا مل رہی ہے ____ وہ اتنا نہیں سوچتا کہ وہ اس کا اپنا ہی لہو ہے جسے وہ اس مزے سے چاٹ رہا ہے۔ یہی حالت ہماری ہو رہی تھی۔ ہمارا لوٹنے والا طبقہ دن بدن فربہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور کوئی نہیں سوچتا تھا کہ قوم کس تیزی سے کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس ساری نفسا نفسی اور افراتفری میں، ایک گروہ ایسا تھا جس کے متعلق عام طور پر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کاروبار میں مصروف ہے۔ وہ گروہ تھا ہماری فوج کا۔ چونکہ ایک تو فوجی یوں بھی شہری آبادیوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور دوسرے ان کے مشاغل بھی صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں، اس لئے ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس دوران میں، قوم نے اس گروہ کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا۔ البتہ جب کبھی بجٹ میں یہ دکھائی دیتا کہ ملک کی آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ مدافعت (DEFENCE) کی "نذر" ہو جاتا ہے تو "دردمندانِ ملت" کے قلب مضطر میں ٹیس پیدا ہوتی اور ادھر ادھر سے اس قسم کی آوازیں آنے لگتیں کہ یہ فوجی بیکار بیٹھے، مفت کی کھاتے رہتے ہیں، ان سے کوئی کام لینا چاہیئے۔ کوئی کہتا کہ ان سے نہریں کھدوانی چاہئیں۔ کوئی کہتا ان سے سڑکیں کٹوانی چاہئیں۔ کوئی کہتا ان سے ہل چلوانے چاہئیں۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک دفعہ جب فوج کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تھا، تو اس طرح دہائی مچا دی گئی جیسے گاؤں

میں ڈاکو گھس گئے ہوں ۔۔۔ بہرحال، فوج کے متعلق اہلِ ملک کو اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ بیکاروں کا ٹولہ مفت کی کھا رہا ہے، ان سے کچھ کام لینا چاہیئے ۔۔۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب پوزیشن صدرِ اول کی سی ہو جس میں ہر مسلمان سپاہی ہوتا تھا تو یہ طریق کار ممکن العمل ہوتا ہے کہ جنگ کے وقت وہ میدانِ کارزار میں ہوں اور دیگر اوقات میں دوسرے کاموں میں مصروف (اور وہ کام بھی درحقیقت کسی نہ کسی نہج سے استحکامِ مملکت ہی سے متعلق ہوتے تھے) لیکن جب انسانیت کی بدبختی سے، اقوامِ عالم نے مستقل فوج (STANDING ARMY) کی طرح ڈال رکھی ہے اور فنِ حرب انتہائی ٹیکنیکل اور (SPECIALISED) ہو گیا ہے تو فوج کے کسی وقت کو فارغ سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن ملک کو بہرحال کچھ علم نہ تھا کہ فوج کچھ کر بھی رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر کر رہی ہے تو کیا۔ عام تاثر یہی تھا کہ فوج بیکار بیٹھی کھا رہی ہے۔

(۵)

نظریۂ ارتقاء کے ماہرین بتاتے ہیں کہ زندگی جب اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتی ہے تو وہ اس قدر سست خرام اور سبک پا ہوتی ہے کہ نہ کوئی آنکھ اس کی رفتار کو دیکھ سکتی ہے نہ کوئی ایک انسان، اپنی زندگی بھر، ان فاصلوں کو پہچان سکتا ہے جنہیں وہ اس طرح طے کرتی ہے۔ آپ کسی پودے کے کنارے صبح سے شام تک بیٹھے رہیئے، آپ محسوس تک نہیں کر سکیں گے کہ وہ بڑھ رہا ہے حالانکہ اس میں مسلسل نشو و نما ہو رہی ہو گی۔ یہ کیفیت اس پودے کی ہے جو دو چار ماہ میں اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگایئے کہ زندگی، جو کروڑ در کروڑ برسوں سے نشو و نما کی منازل طے کر رہی ہے، اس کی حرکت کس قدر غیر محسوس ہو گی۔ قرآن کے الفاظ میں، اس کی رفتار کے پیمانے "خدا کے وہ" دن "ہیں جن میں سے ایک ایک دن کی مدت، ہزار ہزار، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے ارتقائے حیات کی عام رفتار۔ لیکن یہی ماہرین، ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی اپنے ارتقائی سفر کی کئی ایک منزلوں کو یک لخت پھاند جاتی ہے اور جو نتائج کہیں لاکھوں سالوں میں جا کر نمودار ہونے تھے، ان کا ظہور صدیوں میں ہو جاتا ہے۔ اسے، ان کی اصطلاح میں، فجائی ارتقاء، یا (EMERGENT EVOLUTION) کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے، اُس سامانِ نشو و نما کو جس سے زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہے، رحمت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور خدا کی جس صفت سے رحمت کا ظہور ہوتا ہے، اس کے لئے رحیم اور رحمٰن کے الفاظ آئے ہیں۔ ان دونوں کا مادہ تو وہی (ر۔ح۔م) ہے لیکن عربی زبان میں ابواب یا اوزان کی جو خصوصیت ہے، ان کی رُو سے ان دونوں (رحیم اور رحمٰن) میں بڑا اہم فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ رحیم، فعیل کے وزن پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں خدا کی صفتِ رحمت کا ظہور، مسلسل، متواتر، ایک ہی نہج سے ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور رحمٰن، فعلان کے

کے عنوان پر ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہنگامی ضروریات کے وقت' رحمت کا ظہور یک لخت اور بڑی شدت سے ہو۔ نظریہ ارتقار کی رُو سے یوں سمجھئے کہ رحیمیت، عام ارتقار کے لئے' اور رحمانیت، نجاتی ارتقار کے لئے' جس میں انقلاب یک لخت نمودار ہوتا ہے۔

ہماری قوم اس دوران میں ارتقائی منازل' رحیمیت کے انداز سے طے کر رہی تھی ——— نہایت خاموش، غیر مرئی اور غیر محسوس طریقہ سے مسلسل اور متواتر اپنے کام میں مصروف۔ پیہم اور لگاتار' انتہائی ثبات و استقامت سے' اپنی قوت میں اضافہ کرنے میں مشغول ——— کہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح' ہندو نے اُس آگ کو یک لخت اُگل دیا جسے اُس کا حسد و انتقام سے کھچا ہوا سینہ' اٹھارہ برس سے اپنے اندر دبائے چلا آ رہا تھا۔ اچانک اور بلا اعلانِ جنگ کئے حملہ ——— اور اس کے جواب میں' ہماری افواج قاہرہ' بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے ساتھ یوں لپک کر ابھریں' جیسے کچھار سے نکلے اور ایک ہی جست میں گیدڑ کو جا دبوچے۔ ہماری افواج کے اس محیر العقول، برق پاجوششں کردار کو دیکھ کر دنیا بھر کے ماہرینِ فنِ حرب' آج تک انگشت بدنداں ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ کیسے کر دکھایا۔ لیکن ہمیں اس "کیسے" کے جواب کی تلاش میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری افواج' اس تمام دوران' بیکار بیٹھیں مفت کی نہیں کھا رہی تھیں' وہ خدا کی صفتِ رحیمیت کو سامنے رکھتے ہوئے' نہایت خاموشی سے "جہاد کی تیاری میں مصروف"[1] تھیں۔ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کو اپنے اندر متحرک کرتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ قوتیں' تاریخ کے اس نازک ترین لمحہ میں' خدا کی صفتِ رحمانیت کے تتبع میں، یوں یک لخت نمودار ہو گئیں جس طرح بربط کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے' ایک جنبشِ مضراب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اُس زمانے میں یہ خیال (ناواقف لوگوں کی زبان پر) عام تھا کہ ہماری افواج' ہندوستان کے ان عزائم سے بے خبر تھیں اور اسی لئے ان کی طرف سے جو حملہ اچانک ہوا تو اس کی مدافعت کی تدابیر قبل از وقت نہیں کی جا سکی تھیں۔ یہ خیال غلط تھا۔ ہمیں اسی زمانے میں ایک واقفِ حال نے بتایا تھا کہ پاکستانی افواج

---

[1] نبی اکرمؐ سے کسی نے پوچھا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ کہ جب جہاد (قتال) ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔

کی مقابلہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان نے پانچ مختلف گوشوں سے حملہ کیا تھا اور ان میں سے چار مقامات پر ہمارے حفاظتی انتظامات پہلے سے موجود تھے۔ صرف ایک مقام خالی تھا۔ لیکن چونکہ ہماری افواج باقی ہر چہار محاذوں کی طرف سے مطمئن تھیں اس لئے اس پانچویں محاذ کی مدافعت میں زیادہ مشکل نہیں اٹھانی پڑی۔ اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگائیے کہ جس زمانے میں یہ کہا جا رہا تھا کہ ہماری افواج بیکار بیٹھی مفت کی کھا رہی ہیں، وہ اس زمانے میں کیا کچھ کر رہی تھیں۔ بہرحال، جنگ کے سترہ دنوں میں ان جیوش دعا کرنے جو کچھ دکھایا، تاریخ میں اس کی مثال بہت کم ملے گی ــــ تعداد اور اسلحہ وغیرہ ہر لحاظ سے اپنے سے اتنے گنا زیادہ طاقتور دشمن کا اس جرأت و بیباکی سے مقابلہ، اور اس مقابلہ میں اسے ایسی اشتعال شکن شکست کہ وہ تو وہ، اس کی آنے والی نسلیں بھی صدیوں تک ان چوٹوں کو سہلاتی رہیں گی ــــ یہ اللہ کے انہی شیروں کا کام تھا۔

ہمارے ان جانبازوں کی اس فقید المثال بہادری کا لوہا دشمن نے مانا۔ اس کا اعتراف ساری دنیا کے ارباب بصیرت اور اعیانِ سیاست نے کیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ خود ہمارے ہاں کیا ہو رہا تھا؟ یہاں ایک عجیب چال چلی جا رہی تھی۔

آپ اپنی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ (صدرِ اول کے بعد) تاریخ میں علماء و مشائخ کی داستانیں بڑی شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہیں۔ علماء نے حصولِ علم میں جو جو مشقتیں اٹھائیں اور حضرات مشائخ نے "روحانیت" کے جو جو کارنامے کر کے دکھائے، ان کے تذکار جمیلے سے کتابوں کی کتابیں بھری ملیں گی۔ لیکن ان کتابوں میں اربابِ تیغ و سناں کا کہیں ذکر تک نہیں ملیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان حضرات (علماء و مشائخ) کے تصور و خیال تک سے لوگوں کی گردنیں بصد عزت و احترام جھک جاتی ہیں۔ جنگِ ستمبر میں پہلی بار یہ انقلاب رونما ہوا کہ لوگوں کی طرف سے تعظیم و تکریم کے نذرانے، حضرات منبر و محراب اور اربابِ تسبیح و مصلّے کی طرف سے ہٹ کر، مردانِ کارزار کی بارگاہ میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات، جو اپنے حلقہ سے باہر کسی کی تعریف و توصیف کو برداشت نہیں کر سکتے، اس تبدیلی کو کیسے گوارا کر لیتے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک عجیب تدبیر سوچی۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ہمیں جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں، وہ ہمارے سپاہیوں کے کارنامے نہیں بلکہ وہ ان بزرگانِ کرام کا صدقہ ہیں جو "سبز عماموں" اور "سفید گھوڑیوں" کے ساتھ، غائب سے نمودار ہوتے تھے اور دشمنوں پر گولے برسا برسا کر ان کا کچومر نکال رہے تھے۔ اس سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ میں اس قدر محیر العقول کارناموں کا (CREDIT) ان جانبازوں اور سرفروشوں کے بجائے "روحانیت" کے ان علمبرداروں کے حصے میں آ گیا اور تسبیح و مصلّے، تیغ و سناں پر غالب رہا ــــ حالانکہ خدا نے حیاتِ جاوداں، مقتولینِ فی سبیل اللہ کے لئے بتائی ہے۔ زاہدانِ شب زندہ دار، یا

ارباب منبر و محراب کے تھے نہیں ـــ طلوعِ اسلام نے انہی دنوں اس سازش کے خلاف بھرپور مقالات سپردِ قلم کئے تھے جن کا عنوان تھا ـــ ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے ـــ للہ الحمد کہ اربابِ عقل و شعور پر ان مقالات کا نہایت عمدہ اثر ہوا۔

بہرحال ہماری نگہِ احترام جھکتی ہے ـــ اور تاریخ میں جس جس تک بھی یہ کارنامے پہنچیں گے، ان کی نگہِ احترام بھی اسی طرح جھکے گی ـــ ان جسور و غیور مجاہدین کی بارگاہ میں جو شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں نکل آئے اور جنہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے یہ ثابت کر دیا کہ ـــ بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں ـــ ہماری مملکت، ہمارے جان و مال، ہماری عزت و ناموس کے پاسبانو! تم پر خدا کا لاکھ لاکھ سلام ہو۔ تم اس پاسبانی کا مقدس فریضہ ادا نہ کرتے تو آج نہ پاکستان باقی ہوتا، نہ ہم ہوتے۔ ـــ تمہارے اس احسان کے بارِ عظیم سے ملتِ پاکستانیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔

(۰)

اقبالؒ نے کہا تھا۔

مقامِ ہوش سے آساں گزر گیا اقبالؒ
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ جو بازی ہم نے میدانِ کارزار میں اس سرفرازی و سربلندی کے ساتھ جیتی تھی اسے اب ہم بساطِ سیاست پر اس ندامت و خجالت سے ہار رہے ہیں ـــ اور قیامت بالائے قیامت کہ ہار رہے ہیں خود اپنوں کے ہاتھوں ـــ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں (STATE) کا لفظ نہیں بلکہ (STATES) ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ایک مملکت نہیں بلکہ دو الگ الگ آزاد مملکتیں بننی چاہئیں ـــ ایک مغربی پاکستان میں، دوسری مشرقی پاکستان میں ـــ یعنی ان حضرات کو چالیس سال کے بعد اس ریزولیوشن میں (S) نظر آیا ہے ـــ ادھر ون یونٹ توڑنے کے بعد مختلف صوبوں کو یہ پٹی پڑھائی جا رہی ہے کہ تم میں سے ہر صوبہ کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہونی چاہیئے، تاکہ مرکز محض "ثواب" کی خاطر باقی رہ جائے۔ یہ سب کچھ یہاں "لیڈرانِ کرام" کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اور ہندو، انگریز سے، کنکھیوں سے کہہ رہا ہے کہ تم نے دیکھا کہ ہم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست کا کیا انتقام لیا؟

برہمنے بغزنوی گفت کرامتم ببیں　　تو کہ صنم شکستۂ بندہ شدی ایاز را

آسمان کی آنکھ نے اس قسم کا حادثہ کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ قوم رہزنوں سے بچ کر، رہبروں کے ہاتھوں لٹ رہی ہو۔ ہم ان "رہبروں" سے تو کچھ کہنا بے سود سمجھتے ہیں، البتہ قوم سے اتنا ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا تم جنگِ ستمبر کے شہداء کے خون کی قیمت یوں ادا کرنا چاہتے ہو؟

(پ۔ز)

یومِ شہدائے پاکستان

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام بروز اتوار مؤرخہ ۶ ستمبر بوقت ساڑھے ۷ بجے شام

وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال (مال روڈ) لاہور میں

ایک جلسۂ عام منعقد ہوگا۔ جس میں محترم پرویز صاحب شہدائے پاکستان کی

بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔

(نمائندہ۔ بزمِ طلوعِ اسلام۔ لاہور)

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار۔ بوقت صبح ۸½ بجے

بمقام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

کراچی میں

ہر اتوار۔ بوقت ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)

بمقام۔ سیمینار ہال۔ سندھ اسمبلی بلڈنگ۔ سعید منزل

لائلپور میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر جمعہ۔ بوقت ۵½ بجے شام

بمقام۔ دفتر بزمِ طلوعِ اسلام۔ راجہ چوک ریل بازار

ملتان میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر جمعہ۔ بوقت بعد از نمازِ مغرب

بمقام۔ شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ۔ ملتان

(فون۔ ۲۰۷۱)

یہ آئینہ ہے

اسکے سامنے سنبھل کر آیئے، کہ
ہم خود فریبی کے خوگر ہو چکے ہیں' اور
آئینہ کسی کو خود فریبی میں مبتلا نہیں رہنے دیا کرتا!

آیئے۔ آج کی نشست میں ہم جذبات سے یکسو ہو کر' خالص واقعاتی انداز نگاہ سے' ایک ایسے مسئلہ پر غور و فکر کریں جس کا تعلق' ہماری حیاتِ اجتماعیہ کی شاخوں اور پتوں سے نہیں' بلکہ اس کی جڑ اور بنیاد سے ہے۔

قرآن کریم میں' حضرات انبیاء کرام کی بعثت کی غرض و غایت' دو آیات میں یوں بیان کی گئی ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹)۔ تمام نوعِ انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا تو فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا جو انہیں اتحاد و ائتلاف کی زندگی کے خوشگوار نتائج کی بشارت دیتے تھے۔ اور اختلاف و تفریق کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے تھے۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ انبیاء کے ساتھ خدا' اپنی کتاب — ضابطۂ ہدایت — نازل کرتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ جن معاملات میں لوگ اختلاف کریں' ان کا تصفیہ اس ضابطہ کی رو سے کر دیا جائے۔ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ لیکن انبیاء کے جانے کے بعد' وہی لوگ جنہیں وہ کتاب دی جاتی' باہمی ضد اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کے جذبہ کی بنا پر اس میں اختلاف پیدا کر دیتے۔ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ۔ جو لوگ اپنے ایمان پر پختہ ہوتے انہیں ان اختلافات

کی تاریکیوں میں بھی اتحاد و ائتلاف کی راہ دکھائی دے دیتی۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۲/۲۱۳)۔ اور یہ چیز کسی خاص گروہ، خاص قوم، خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں۔ خدا کی کتاب موجود ہو، تو جو بھی چاہے اس سے زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ کی طرف راہ نمائی حاصل کر سکتا ہے۔

انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد

ان دو آیات میں، سارا پروگرام نکھر اور ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی :-

(۱) زندگی کے ابتدائی دور میں، انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) کی شکل میں رہتے تھے۔ ان میں کوئی گروہ بندی نہ تھی۔ تفرقہ نہیں تھا، اختلاف نہیں تھا۔

(۲) بعد میں، انفرادی مفاد پرستیوں اور گروہ بندانہ تغلب اندیشیوں نے، اس برادری میں تفرقے پیدا کر دیئے اور انسانیت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

(۳) ان میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کیلئے، خدا نے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ ایک نبی آتا۔ اپنے ساتھ ضابطہ ہدایت لاتا۔ اس ضابطہ کی رُو سے، تمام اختلافی امور کے فیصلے ہوتے اور اس طرح ایک ایسی امت کی تشکیل ہو جاتی جس میں کوئی تفرقہ، کوئی اختلاف نہ ہوتا۔

(۴) نبی کے چلے جانے کے بعد، خود اس کتاب کے نام لیواؤں میں گروہ بندانہ مفاد و تغلب کے جذبات اُبھرتے اور ان میں اختلافات پیدا ہو جاتے۔ اس کے بعد پھر ایک نبی آتا اور ان کے اختلافات رفع کر کے امتِ واحدہ کی تشکیل کر دیتا۔

(۵) اس امت کی اساس، اس ضابطہ خداوندی کی صداقت و محکمیت پر ایمان، اور عملاً اس اقرار و اعتراف پر تھی کہ ہم اپنے تمام اختلافی معاملات کا حل اس ضابطہ کی رُو سے دریافت کیا کرینگے۔ خود اس ضابطہ میں اس امر کی صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ تمام اختلافی امور کا نہایت اطمینان بخش حل دے دے۔

(۶) تشکیلِ امت کے اس طریق کا نام، آج کی اصطلاح میں، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر قومیت کی تعمیر ہے۔ یعنی رنگ، نسل، زبان، وطن وغیرہ کے تمام اختلافات سے بلند ہو کر، خالص آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ایک امت (یا قوم) کی تشکیل۔

تشکیلِ امت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا لیکن چونکہ ازمنۂ قدیمہ میں وسائلِ رسل و رسائل بہت کم اور ذرائع مواصلات محدود تھے، اس لئے اس قسم کی امتیں محدود علاقوں میں متشکل ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد، جب دنیا ایک نئے دور میں داخل ہونے کے قریب آئی تو رشد و ہدایت کے اس سلسلۂ دراز کی

آخری کڑی حضور نبی آخرالزمانؐ کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ آپؐ کے متعلق اعلان کر دیا گیا کہ آپؐ کی رسالت کسی خاص قوم، خاص ملک سے محدود اور کسی خاص زمانہ تک محدود نہیں۔ آپؐ رسولٌ کافّۃً للناس ہیں یعنی تمام نوعِ انسان کی طرف رسول۔ اور جو ضابطۂ ہدایت (قرآنِ کریم) آپؐ کی وساطت سے بھیجا جا رہا ہے وہ

امتِ محمدیہ کی تشکیل

ذکر للعالمین ہے — یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے دستورِ حیات — اس ضابطہ کی بنیادوں پر، یعنی آئیڈیالوجی کے اشتراک سے حضورؐ نے ایک امت کی تشکیل فرمائی جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ کوئی افتراق نہیں تھا۔ اس میں کوئی مذہبی فرقہ نہیں تھا، کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی۔ نہ ان میں عقاید کا کوئی اختلاف تھا نہ نظریات کا تفاوت۔ نہ ان کی منزلیں الگ الگ تھیں نہ راستے جدا جدا۔ ایک منزل، ایک راستہ، ایک کارواں، اس کا ایک قائد۔ جو اختلافی معاملہ ان کے سامنے آتا اس کا حل قرآن سے دریافت کر لیا جاتا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

(۱) اس امت سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ۔ (۴۲/۱۰)۔ جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو، اس کے فیصلے کے لئے خدا کی طرف رجوع کیا کرو۔

(۲) لیکن خدا تو ایک بسیط حقیقت ہے۔ اس کی طرف رجوع کیسے کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے خود ہی کہہ دیا کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا عملی طریق یہ ہے کہ خدا کی کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ اس نے کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہی یہ بتایا کہ

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

خود اس کتاب کے متعلق کہہ دیا کہ "اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں" (۴/۸۲)۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ کوئی پیچیدگی نہیں۔ اس میں ہر بات صاف صاف اور واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے (۱۶/۸۹) "ہر بات کو کھول کھول کر بیان کر دینے والی"۔ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ (۶/۱۱۴)

(۳) لیکن کتاب تو حروف و نقوش کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس سے فیصلہ کیسے لیا جائے؟ اور اگر اس سے اختلافی معاملہ کی وضاحت بھی ہو جائے تو اس فیصلہ کو پوری امت پر نافذ کس طرح کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی محسوس و ناطق اتھارٹی کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ رسولؐ کی موجودگی میں اس قسم کی اتھارٹی اس کے سوا اور کون ہو سکتی تھی؟ اس لئے بھی کہ اس اتھارٹی کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اَتْقَاكُمْ ہو۔ (۴۹/۱۳) تم میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار — یعنی قوانینِ خداوندی کا پابند — اور امت میں رسولؐ سے

بڑھ کر تقویٰ شعار اور کون ہو سکتا تھا۔ اس لئے رسولؐ اللہ سے کہہ دیا گیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔

اسلامی نظام

(۴) ان فیصلوں کے سلسلہ میں رسولؐ اللہ سے یہ کہہ دیا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۹)۔ فیصلہ طلب امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کر لیا کرو۔ اس سے ایک نظام وجود میں آ گیا۔ جسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ اس نظام کے امتیازی خطوط یوں تھے کہ

(۱) ایک امت (قوم) تھی جس میں نہ الگ الگ فرقے تھے نہ پارٹیاں۔

(۲) اس امت کی ایک مملکت تھی جس کا ایک ہی سنٹر تھا۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اس مملکت کی حکومت وحدانی (UNITARY FORM) کی تھی جس میں مرکز ایک ہوتا ہے۔

(۳) اس مرکز کا ایک سربراہ تھا اور اس کی مجلسِ مشاورت۔

(۴) امورِ مملکت کے فیصلوں کے لئے قرآن دستور العمل تھا۔ اسی کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل تھا یعنی مملکت کی (SOVEREIGN AUTHORITY) قرآن تھا — نہ عوام، نہ پارلیمان، نہ سربراہِ مملکت۔ قرآن کے اسی اقتدارِ اعلیٰ کا نام "حکومتِ خداوندی" تھا۔

(۵) جو فیصلہ قرآن کریم کی روشنی میں، باہمی مشاورت کے بعد، سربراہِ مملکت کیطرف سے نافذ کیا جاتا اس کا اطلاق تمام افرادِ امت پر یکساں ہوتا۔ اس میں نہ عبادات اور معاملات میں کوئی فرق تھا، نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی کوئی تفریق — نہ الگ الگ مسجدیں[1] تھیں، نہ الگ الگ جماعتیں، نہ الگ الگ روایتیں تھیں نہ الگ الگ فقہیں۔ نہ الگ الگ احکام تھے نہ الگ الگ حکومتیں — ایک خدا، ایک قرآن، ایک رسول، ایک امت، ایک مملکت، ایک حکومت، ایک قانون — اس کا نام تھا اسلام۔

اس نظام کی تشکیل کے بعد امت سے کہہ دیا کہ تم نے دیکھ لیا ہے کہ رنگ، نسل، زبان، اوطان کے اختلافات سے بلند ہو کر کس طرح آئیڈیالوجی کے اشتراک سے، تم میں مثالی وحدت پیدا کر دی گئی ہے۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اگر تم میں تفرقہ پیدا ہو گیا تو تم موحد نہیں رہو گے مشرک ہو جاؤ گے۔ لہٰذا اس کی سخت احتیاط برتو کہ۔

تفرقہ شرک ہے!

---

[1] رسولؐ اللہ کے زمانے میں، منافقین نے "خدمتِ دین" کی آڑ میں ایک الگ مسجد تعمیر کر دی تھی۔ خدا نے فوراً حکم بھیج دیا کہ جس مسجد سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو وہ مسجد نہیں، خدا اور رسولؐ کیخلاف جنگ کرنیوالوں کی کمین گاہ ہے اسلئے حضورؐ نے اس مسجد کو جلا دیا تھا۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

تم (ایک امت بننے کے بعد پھر سے) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ اور ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ گروہ سازی میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے گروہ بندانہ نظریات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ دین میں تفرقہ نہ پیدا کر لینا، تو اس سے مذہبی فرقے ہی مراد نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی، ہر قسم کی تفریق مراد ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے، مذہب اور سیاست یا دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا، امت واحدہ میں ہر قسم کا تفرقہ، (قرآن کی نص صریح کی رو سے) شرک ہے۔

اس کے ساتھ ہی رسولؐ اللہ سے کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۔ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کریں اور ایک گروہ بن بیٹھیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور اس امر کا اعلان کر دیا کہ اگر تم میں تفرقہ اور اختلاف پیدا ہو گیا تو تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (۳/۱۰۴)

اس طرح رسولؐ اللہ نے وحدتِ امت کا ایک عملی نظام قائم کر دیا۔ یہ نظام درحقیقت وحدتِ انسانیت کے عالمگیر پروگرام کی پہلی کڑی تھا۔ اسی لئے اس وحدت کی مظہر امت کو امتِ وسطیٰ (۲/۱۴۳) "ایک مرکزی جماعت" اور شہداء علی الناس (۲/۱۴۳) تمام نوعِ انسان کے اعمال کی نگران کہہ کر پکارا گیا۔

رسولؐ اللہ کے بعد اسلام کے اس نظام کی وسعتیں تو زمان اور مکان کی حدود سے ماورا تھیں، لیکن اس میں ایک کڑی ایسی تھی جس کی حیاتِ ارضی بہرحال محدود تھی۔ یہ کڑی تھی خود نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی۔ آپؐ کے متعلق یہ کہہ کر وضاحت کر دی کہ

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ ۔ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۔ وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۔ (۳/۱۴۳)

محمدؐ بجز اس نیست کہ خدا کا ایک پیغام رساں ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغام رسانِ خداوندی آئے۔ اور اپنی حیاتِ ارضی پوری کر کے دنیا سے چلے گئے

> اگر کل کو یہ رسول بھی اپنی طبعی موت مرجائے یا قتل کردیا جائے تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ نظام تو اسی کی ذات سے وابستہ تھا، پھر سے قبل از اسلام نظامِ زندگی کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو تم میں سے ایسا کریگا وہ اپنا ہی نقصان کریگا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اور جو اس کے مطابق زندگی بسر کرے گا، شکر گزارِ نعمتِ خداوندی ہوگا، اسے اس کے حسنِ عمل کا صلہ ملیگا۔

اس سے قرآن نے واضح کردیا کہ اسلام کا نظام، حضورؐ کی زندگی تک ہی محدود نہیں تھا، اسے آگے بھی چلنا تھا۔ اس نظام کی مختلف کڑیوں میں سے جب یہ کڑی نہ رہے تو اپنے میں سے "اتقیٰ" (سب سے زیادہ تقویٰ شعار) سے اس خلا کو پورا کرلو۔

(٠)

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یہ نظام اسی طرح قائم رہا۔ ایسا تسلیم کرنے کی ہمارے پاس دلیل یہ ہے کہ رفقائے رسول اللہؐ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ (مہاجرین ہوں یا انصار) مومن حقا تھے۔ (۸/۷۴) اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے پیرو۔ اس لئے مومنینؓ کی جو صفات و خصوصیات قرآن نے بیان کی ہیں وہ ان کے حامل تھے۔ اور مومنین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی، اور باہمی محبت کے پیکر ہوتے ہیں۔ وہ اسلامی نظام کے قیام و استحکام کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے ہیں۔ صحابہ کبارؓ کے زمانے میں چونکہ اسلامی نظامِ مملکت علیٰ منہاجِ رسالت قائم تھا اسلئے امت کی وحدت بھی قائم تھی۔ ان میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا —— اسلئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) قرآن کریم نے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ جن حضرات کو قرآن 'مومن حقا' کہہ کر پکارے وہ (معاذ اللہ) مبتلائے شرک ہو جائیں۔

تاریخ کی حیثیت

صحابہ کبارؓ کے متعلق جو کچھ ہماری تاریخ میں آیا ہے اسے آنکھیں بند کرکے قبول نہیں کرلینا چاہیئے۔ یہ تاریخ، اُس دور سے اڑھائی تین سو سال بعد، زبانی روایات کی بنا پر مرتب ہوئی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب امت کی گاڑی مدت سے' اسلامی نظام کی پٹڑی سے اتر کر، ملوکیت کے راستے پر پڑ چکی تھی۔ عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صحابہؓ سے متعلق تاریخ کے ردّ و قبول کا معیار قرآن کریم کو قرار دینا چاہیئے۔ اس تاریخ میں ان حضرات کے متعلق جو کچھ آیا ہے، اگر وہ اس سیرت و کردار کا مظہر ہے جسے قرآن نے مومن کا شعار قرار دیا ہے تو اسے صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ اس کے خلاف ہے تو اس تاریخی بیان کو دیوار پر دے مارنا چاہیئے۔ اسلئے کہ اسے صحیح تسلیم کرنے سے قرآن کی وہ شہادت غلط قرار پاتی ہے جو ان کے متعلق اس میں بصراحت مذکور ہے۔ ہم قرآن

پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں۔ زید، بکر، عمر کے نوشتوں پر نہیں۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ عہدِ صحابہ رضہ تک امّت کی وحدت قائم رہی۔ اس کے بعد نہ اسلام کا نظام باقی رہا نہ وحدتِ امت۔ یہ کب ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا، یہ امور ہمارے موضوعِ زیرِ نظر سے خارج ہیں۔ آپ

ہماری حالت

اس بحث میں اُلجھے بغیر، اپنے زمانہ کی طرف آجائیے۔ اور دیکھئے کہ ہماری حالت کیا ہے۔

(۱) دنیا میں قریب ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ لیکن کیا یہ امتِ واحدہ ہیں؟ نام کے اعتبار سے تو یہ مسلمان (یا مغربی اصطلاح میں محمڈن) ضرور ہیں۔ لیکن اس اشتراکِ رسمی کے علاوہ ان میں کوئی اور قدرِ مشترک بھی ہے؟

(۲) ان مسلمانوں کی متعدد اپنی آزاد مملکتیں ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اسلامی نظام کی رُو سے امت میں ایک سے زیادہ مملکتوں ..... کا تصور ہی باطل ہے۔ اس نظام میں، تمام امت کی ایک مملکت اور اس کا ایک مرکز ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ان الگ الگ مملکتوں کا وجود ناگزیر تھا، تو غور طلب بات یہ ہے کہ کیا ان میں کوئی ایک مملکت بھی ایسی ہے جس میں وہ اسلامی نظام قائم ہے جس کی قرآنی تفصیلات اوپر دی جا چکی ہیں؟ قرآن کریم نے کہا تھا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰)۔ یہ حقیقت ہے کہ تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ کیا ان مختلف مملکتوں کا باہمی رشتہ اخوت کا ہے؟ ـــــ قرآن نے کہا تھا۔ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ .... عَذَابًا عَظِيْمًا۔ (۴/۹۳) جس شخص نے کسی ایک مومن کو بھی عمداً قتل کر دیا، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب ہے۔ اس کی لعنت ہے اور بہت بڑا عذاب۔ یہ ہے خدا کا ارشاد۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کیا یہ مملکتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار نہیں رہتیں۔ اور ایک "بھائی" دوسرے "بھائی" کا گلا نہیں کاٹتا؟ کیا ان میں سے کوئی بھی "اشتراکِ ایمان" کی بناء پر ایک دوسرے کے ساتھ ائتلاف تو ایک طرف رہا، محض اتحاد کرنے کے لئے تیار ہے؟ قرآن نے کہا تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۴/۱۴۱) یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا کافروں کو مومنوں پر غلبہ دیدے؟ کیا ان مملکتوں میں سے کوئی مملکت بھی ایسی ہے جس پر کسی نہ کسی رنگ میں، بالواسطہ یا بلاواسطہ کفار کا سیاسی، تمدنی، یا معاشی غلبہ نہ ہو؟ کوئی بھی ایسی ہے جو غیر مسلم مملکتوں کی دست نگر نہ ہو؟

(۳) کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم مسلمانوں میں قومیت کا معیار نسل ہے یا وطن۔ اور امت ان چار دیواریوں میں گھر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔

(۱) مختلف مملکتوں سے نیچے اتر کر، اب کسی ایک مملکت کی طرف آئیے۔ کیا اس مملکت کے تمام مسلمان باشندے "امتِ واحدہ" ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک ہی مملکت کے اندر مسلمان ذاتوں، برادریوں (یعنی نسلی امتیازات) کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں! وطنی اعتبار سے ایک صوبے میں بسنے والے مسلمان دوسرے صوبے میں بسنے والے مسلمانوں کے رقیب ہیں اور باہمی تعصب کی بنا پر، ایک دوسرے کے مفاد کے دشمن۔ سیاسی پارٹیوں کی طرف آئیے، تو ان کی باہمی سر پھٹول کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

(۵) اور آخر میں مذہب کی طرف آئیے۔ کیا کوئی خطۂ زمین بھی ایسا ہے جس میں صرف "مسلمان" بستے ہوں، اور وہ شیعہ، سنی، اہلِ حدیث، حنفی، حنبلی، مالکی، شافعی، کی گروہ بندیوں میں بٹے ہوئے نہ ہوں۔ اور ان فرقوں میں کوئی فرقہ بھی ایسا ہے جو قرآن اور صرف قرآن کو دین میں سند و حجت مانتا، اختلافی معاملات میں اسے حکم تسلیم کرتا اور اس اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کی اطاعت قبول کرتا ہو!

اس کے بعد آپ اس آخری بات کو سامنے لائیے جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ اس پر جذبات سے الگ ہٹ کر، واقعاتی انداز نگاہ سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ آخری بات یہ کہ دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ مسلمان تو بستے ہیں لیکن کیا یہاں کسی جگہ اسلام بھی موجود ہے! زید، بکر، عمر کے تصور کا اسلام نہیں، وہ اسلام جس کا تصور قرآن نے پیش کیا تھا اور جسے ہم شروع میں سامنے لا چکے ہیں۔ یہ ہے وہ اہم سوال جسے نمایاں طور پر سامنے رکھ کر آگے بڑھئے۔ بات بالکل واضح ہے۔

اسلام کہاں ہے؟

جب امت، امتِ واحدہ نہیں تو ان میں اسلام بھی کہیں نہیں۔ قرآن نے تفرقہ کو شرک قرار دیا تھا جس امت میں تفرقہ ہے، وہ بہ نصِ صریح قرآنیہ شرک میں مبتلا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شرک اور اسلام ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

ہم جانتے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت اس پر سخت چیں بہ جبیں ہوگی۔ لیکن آپ ان حضرات کے سامنے قرآن مجید کی وہ آیات رکھئے جنہیں پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اور پھر ان سے پوچھئے کہ ان کے معانی کیا ہیں۔ بات واضح ہو جائے گی۔ ان میں سے ہر ایک یہ کہیگا کہ قرآن کی یہ آیات برحق ہیں لیکن ان کا اطلاق ہم پر نہیں ہوتا۔ ہم تو اصلی اسلام کے پیرو مسلمان ہیں۔ تفرقہ دوسروں نے پیدا کر رکھا ہے اور اس کے ہم ذمہ دار نہیں (ان میں سے ہر ایک یہی الفاظ کہے گا۔ اور یہ اس لئے کہ قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ فرقہ بندی میں ہوتا یہ ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر اور باقی سب کو باطل پر قرار دیتا ہے)۔ لیکن آپ ایسا کہنے والوں سے یہ پوچھئے کہ بہت اچھا صاحب! آپ اصلی اور حقیقی اسلام کے پیرو ہیں۔ فرقے دوسروں نے پیدا کئے ہیں۔ لیکن آپ یہ فرمائیے کہ جس فرقے سے آپ متعلق ہیں، کیا قرآن میں مسلمانوں کو اس نام سے پکارا

گیا ہے ؟ کیا رسول اللہ نے اپنے آپ کو اس نام سے متعارف کرایا تھا ؟ قرآن نے تو کہا تھا کہ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (۲۲/۷۸) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اور رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶/۱۶۳) میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔

اور اس کے بعد ان سے کہئے کہ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں کہ کل سے آپ اپنے آپ کو (مثلاً) شیعہ نہ کہیں صرف مسلمان کہیں سنی نہ کہیں مسلمان کہیں۔ اہل حدیث، حنفی، مالکی، شافعی وغیرہ نہ کہیں صرف مسلمان کہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ "اصلی اور حقیقی اسلام" کے پیرو ہونے کے مدعی' اتنی سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔

اور یہ تو صرف نام کی بات ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی شخص اپنے معتقدات و نظریات، مسلک اور مشرب میں ذرا سی تبدیلی کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوگا۔

یہ ہے اس وقت مسلمانوں کی حالت!

(۵)

امت کی اس عبرت انگیز اور المناک حالت سے متاثر ہو کر، مصلحینِ ملت وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے کہ ملت کے اس تشتت و انتشار اور افتراق و اختلاف میں اتحاد کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ماضی قریب میں' ان میں سرفہرست سید جمال الدین افغانی رح کا نام نامی دکھائی دیتا ہے۔ سید صاحب کی ساری عمر اس مقصد کے حصول کے لئے صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں میں بسر ہوگئی۔ انہوں نے قریب قریب تمام مسلم مملکتوں کا دورہ کیا۔ ان کے ارباب حل و عقد سے رابطہ اور ضابطہ قائم کیا۔ ان کے باہمی اتحاد و اتفاق کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

مصلحین امت کی ناکامی

افغانی (علیہ الرحمۃ) کے بعد، یہی صدائے دلخراش اقبال رح کے قلب درد آگیں سے ابھری اور وہ ساری عمر اسی کی تلقین کرتے رہے۔ کبھی انہوں نے کہا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائیگا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی　　　اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

اور کبھی یہ کہ

یہ ہندی وہ خراسانی ، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وہ ساری عمر اس صدائے دردناک کو عام کرتے رہے لیکن اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک عملی پروگرام سوچا اور اپنی آواز کو ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود کر دیا تاکہ اس عالمگیر اخوت کا آغاز اس خطۂ زمین سے کیا جائے۔ یہاں انہوں نے قرآنِ کریم کے اس بنیادی اصول کو اجاگر کیا کہ اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ ایمان ہے، نہ کہ اشتراکِ وطن۔ اور اس اصول کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے الگ، ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (اس سے پہلے سرسیدؒ نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا)۔ اس کے بعد اقبالؒ نے اسلامی نظام کا دوسرا بنیادی اصول پیش کیا کہ مسلمان، اسلام کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں اسلام کے اصول و احکام عملی نظام کی شکل میں کارفرما ہوں۔ یہ دو اصول مطالبۂ پاکستان کی بنیاد قرار پائے۔ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں کہا تھا کہ اس آزاد مملکت کے حصول کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام پر جو ٹھپہ عربی ملوکیت نے لگا دیا تھا وہ دور ہو جائے گا۔ اور قبل از دورِ ملوکیت کا حقیقی اسلامی نظام دوبارہ وجود میں آسکے گا۔ یہ تھی حصولِ پاکستان کی غایت۔ اقبالؒ کے بعد پاکستان کی اسی غرض و غایت کو قائداعظمؒ دہراتے رہے حتیٰ کہ پاکستان وجود میں آگیا۔

پاکستان کی غرض و غایت

پھر سن لیجئے کہ حصولِ پاکستان کی غرض و غایت کیا تھی؟ یہ کہ

(۱) پاکستان ایک ایسا خطۂ زمین ہوگا جو تجربہ گاہ بنے گا اس اسلامی نظام کے احیاء کا جو عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہ میں وجہ شادابیٔ عالم ہوا تھا۔

(۲) اس مملکت میں بسنے والے تمام مسلمان، اشتراکِ ایمان کی بنا پر، ایک قوم (امتِ واحدہ) قرار پائیں گے۔ اس امت میں رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی تفریق، صوبائی تقسیم، ذات، گوت، برادری، وغیرہ کے غیر فطری امتیازات ختم ہو جائیں گے اور دنیا ایک بار پھر انما المؤمنون اخوۃ۔ کا جنت نگاہ نظارہ دیکھ لے گی۔ غیر مسلم (یعنی جو اس نظریہ پر ایمان نہ رکھتے ہوں) اس امت کا جزو نہیں قرار پا سکیں گے۔

(۳) اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں

رفتہ رفتہ فرقہ بندانہ تعصبات ختم ہو جائیں گے۔ اور یوں ایک دن تفرقہ کا شرک اختلافِ قلبی کی وحدت سے بدل جائے گا۔

(۴) اس کامیاب تجربہ کو دیکھ کر دنیا کے دیگر مسلم ممالک بھی اسی نظام کو اپنے ہاں رائج کرتے چلے جائیں گے اور اس طرح تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے، ایک بار پھر رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جائیں گے ___ اور ظاہر ہے کہ جب ساٹھ ستر کروڑ نفوس قلبی رشتہ سے بنیانِ مرصوص (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بن جائیں تو دنیا کی کونسی طاقت ان پر غالب آسکتی ہے؟

یہ تھیں وہ حسین آرزوئیں اور شاداب تمنائیں جو مملکتِ پاکستان کے حصول و قیام کا محرک ہوئی تھیں۔

———— (۰) ————

اس خواب کی تعبیر

یہ ہمارا خواب تھا ___ اور اس خواب کی تعبیر کیا ہے، اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ ___ صورت ببیں حالم مپرس! صورت اس وقت یہ ہے کہ ایمان کے اشتراک سے امت کی تشکیل تو ایک طرف، ہم دنیا کی عام اقوام کی طرح، وطن یا مملکت کے اشتراک سے بھی ایک قوم نہیں بن سکے ___ یہاں بنگالی بستے ہیں، بلوچی بستے ہیں، سندھی بستے ہیں، پنجابی بستے ہیں، پختون بستے ہیں۔ لیکن پاکستانی کہیں نظر نہیں آتے۔ اور پھر ان بنگالیوں، بلوچوں، سندھیوں، پنجابیوں، پختونوں میں باہمی تعصب کا عالم یہ ہے، کہ (عام تاثر یہ ہے کہ) ایک بنگالی مسلمان کے نزدیک غیر بنگالی مسلمان کے مقابلہ میں، بنگالی ہندو زیادہ عزیز ہے۔ (ہم نے بنگالی اور غیر بنگالی کا نام محض بطور مثال لیا ہے۔ یہی کیفیت دوسری جگہ بھی پائی جاتی ہے) سیاسی افتراق کا یہ عالم ہے کہ تقسیم سے پہلے، اصولی طور پر مسلمانوں کی دو ہی سیاسی پارٹیاں تھیں ___ ایک مسلم لیگ جو مطالبۂ پاکستان کی محرک و مؤید تھی۔ اور دوسری متحدہ قومیت کے حامیوں کی۔ لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ جو اینٹ اٹھائیے اس کے نیچے سے ایک نئی سیاسی پارٹی ابھر کر سامنے آجائے گی۔ اور ان پارٹیوں میں جو کچھ باہمی ہو رہا ہے اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ ملک، انسانوں کی بستی نہیں، درندوں کا بھٹ ہے جس میں ہر گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا، اور ہر جماعت دوسری جماعت کی جان کی لاگو ہے ___ اور تعصب کا یہ عالم کہ سابقہ الیکشن کے زمانے میں، جماعتِ اسلامی کے امیر مودودی صاحب نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں ایک ہندو کو ترجیح دوں گا۔ مذہبی تفرقہ کی یہ کیفیت کہ ۱۹۶۲ء کے آئین میں مختلف فرقوں کا ذکر نہیں تھا ___ یہ ایک خوش آئند علامت تھی ___ لیکن مذہب پرست طبقہ نے (جسے اب "اسلام پسند" کی جدید اور نہایت شرمناک اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے ___ "شرمناک" اس لئے کہ اس

سے دنیا کو یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مسلمان تو کہلاتے ہیں لیکن اسلام کو پسند نہیں کرتے۔ کیا کسی قوم کی طرف سے اس قسم کا اعلان، باعثِ شرم وندامت نہیں !!)۔ ہاں! تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں فرقوں کا ذکر نہیں تھا۔ لیکن مذہب پرست طبقہ (بالخصوص جماعتِ اسلامی) نے اس کے خلاف ہنگامے برپا کر دیئے اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک آئین میں اس دفعہ کا اضافہ نہ کرا لیا کہ شخصی معاملات میں، ہر فرقہ کتاب وسنت کی تعبیر اپنی اپنی فقہ کے مطابق کرے گا۔ اس سے فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا ہو گئی۔ اب وہ بد قسمت مسلمان، جو فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہے اور اس لئے اپنے آپ کو کسی فرقہ سے منسوب نہیں کرتا، محوِ حیرت ہے کہ اگر ملک میں ان حضرات کے اسلام کا نظام رائج ہو گیا تو اس کے معاملات کا فیصلہ کون سی فقہ کی رُو سے ہوا کرے گا۔

جہاں تک نظم ونسق کا تعلق ہے، مملکتِ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے لئے ایک مضبوط مرکز، اور مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کا ایک وحدت (ون یونٹ) میں ادغام، وحدتِ ملت کے لئے عمدہ ذرائع بن سکتے تھے۔ لیکن مغربی پاکستان کی وحدت تو ٹوٹ چکی ہے اور مشرقی پاکستان سے ابھرنے والے "چھ نکات" کا عملاً مفہوم یہ ہے کہ اس خطہ کو ایک جداگانہ آزاد مملکت بنا دیا جائے ــــ اور جب اسے یہ حیثیت حاصل ہو جائے تو پھر مغربی پاکستان کے صوبوں کی طرف سے بھی اس قسم کا مطالبہ پیش کر دیا جائے۔ یوں اس جسدِ مملکتِ پاکستان کے تمام اعضاء ایک ایک کر کے الگ کر دیئے جائیں اور کہا یہ جائے کہ اس سے جسدِ مملکت زیادہ مستحکم اور توانا ہو جائے گا۔ کوئی ان فلیسوفوں سے پوچھے کہ جب جسد کے اعضاء الگ الگ کر دیئے جائیں، اس (جسد) کا وجود کہاں رہتا ہے؟ نام نہاد مرکز اور خود مختار صوبوں کے معنی ہیں پاکستان کا خاتمہ۔

وہ ہمارا خواب تھا ــــ اور یہ اس خواب کی تعبیر ہے!

(٠)

کیا یہ اسلام کی شکست ہے؟

یہاں سے ایک نہایت اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے ــــ اہم بھی اور نازک تر بھی ــــ نازک تر اس لئے کہ جو قوم جذبات میں ڈوب جانے کی عادی ہو جائے، جب اسے حقائق کے آئینے میں اس کی شکل دکھائی جائے تو وہ جھنجلا کر آئینہ ہی کو توڑ دیا کرتی ہے۔ لیکن کبھی تو حقائق کا سامنا کرنا ہی ہوگا ــــ کبھی تو اس خود فریبی سے نکلنا ہی ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بنیادوں پر ایک امت کی تشکیل اسلام کے صدرِ اول میں ہوئی۔ تھوڑے عرصہ تک وہ وحدت قائم رہی۔ اس کے بعد اس امت میں تفرقہ پیدا ہونا شروع ہوگیا اور وہ تفرقہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اسے دور کرنے کی جس قدر کوششیں کی گئیں وہ ناکام رہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے تو کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اسلام نے جو یہ اصول پیش کیا تھا کہ اشتراکِ دین کی بنیاد پر وحدت پیدا کی جائے، وہ اصول ہی سرے سے غلط اور ناممکن العمل تھا۔ انہوں نے مطالبۂ پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

> یہ سب سے بڑا فریب (FRAUD) ہے جس میں لوگوں کو مبتلا کیا جا رہا ہے کہ دین کا سررشتہ، اُن خطوں کو متحد کر دیگا جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہا تھا جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے ماوراء ہو۔ لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ چند ہی سالوں کے بعد — یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد، اسلام اس قابل نہ رہا کہ مسلمانوں کے مختلف ممالک کو محض اسلام کی بنیاد پر، ایک مملکت بنا سکے۔ (لہٰذا، اب اس ناکام تجربہ کو دہرانا حماقت یا فریب نہیں تو اور کیا ہے؟)
>
> (INDIA WINS FREEDOM. P. 227)

آج ابوالکلام آزاد زندہ ہوتے تو بغلیں بجاتے ہوئے کہتے کہ تم نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہوا! لیکن اگر (مولانا) آزاد آج زندہ نہیں تو کیا؟ ان کے بیشمار متبعین اور ہم خیال یہاں موجود ہیں۔ پاکستان کے اس انتشار پر وہ یقیناً کہیں گے کہ — کیوں ہم نہ کہتے تھے! لیکن سوال کسی کے ایسا کہنے یا نہ کہنے کا نہیں۔ جب یہ تاریخی حقیقت ہے — اور پاکستان کے تجربہ نے اس کی تازہ شہادت بہم پہنچا دی ہے، تو ہم پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ ہم جذبات سے الگ ہٹ کر، غور کریں کہ اس کا اصلی سبب کیا ہے؟

اس کا سبب کیا ہے؟

اس سبب کے سمجھنے کے لئے، ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

آپ نے اس قسم کے نام اکثر سنے ہونگے — قاضی احمد اللہ، مفتی سعید الرحمٰن، حکیم احمد حسن — نام یہ عام ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان میں سے نہ کوئی قاضی ہوتا ہے، نہ مفتی، نہ حکیم۔ ان کے بزرگوں میں سے

کوئی ایسا تھا، اور اس خصوصیت کی بنا پر ان کی شہرت تھی۔ وہ دنیا سے چلے گئے اور ان کے اہل خاندان نے یہ خصوصیت اپنے نام کا جزو بنالی۔ جیسے کہ بعض شہروں میں محلہ قاضیاں، مفتیاں محلہ، بازار حکیماں بھی ہوتے ہیں، لیکن نہ ان محلوں میں کوئی قاضی یا مفتی ہوتا ہے نہ ان بازاروں میں کوئی حکیم۔ کسی زمانے میں وہاں ان خصوصیات کے حامل رہتے ہوں گے۔ وہ ختم ہو گئے لیکن ان محلوں اور بستیوں کے نام اسی طرح متوارث چلے آتے ہیں۔

اب فرض کیجئے کہ تپ دق کا کوئی مریض "حکیم احمد حسن" سبزی فروش کے پاس چلا جائے اور وہ بھی اسے کچھ ٹوٹکے بتائے۔ مریض کی وفات ہو جاتی ہے۔ اور اس پر اس کے لواحقین کہنا شروع کر دیں کہ حکمت (طب یونانی) میں تپ دق کا کوئی علاج نہیں، ہم نے آزما کر دیکھ لیا ہے۔ تو فرمائیے ان کا یہ فیصلہ کہاں تک مبنی بر حقیقت ہوگا۔ حکیم تو وہ ہوگا جس نے باقاعدہ حکمت (طب) پڑھی ہو اور اس کے مطابق طبابت کرتا ہو۔ اگر یہ اطباء طبابت کے اصولوں کے مطابق علاج کریں اور تپ دق پر قابو نہ پا سکیں تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ طب یونانی، تپ دق کے علاج سے قاصر ہے۔ اُس سبزی فروش کے علاج کی ناکامی سے جس کا محض خاندانی نام "حکیم" ہے، طب یونانی کو موردِ الزام ٹھہرانا کس طرح صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟

جو غلطی تپ دق کے اس مریض اور اس کے متعلقین نے کی تھی، اسلام کے متعلق بعینہٖ وہی غلطی ہم کرتے ہیں۔ ہم نے اسلام اور مسلمانوں کو مرادف سمجھ لیا ہے۔ اور مسلمانوں کی ناکامی کو اسلام کی ناکامی قرار دے دیتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ (مولانا) آزاد جیسا باریک بین اسلام اور مسلمانوں کے فرق کو نہ سمجھ سکا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے محض اپنے مسلک (متحدہ قومیت) کو حق بجانب قرار دینے کے لئے، مسلمانوں کی نا رسائی کو بطور سند پیش کر دیا۔ اگر وہ اپنے آپ کو یہیں تک محدود رکھتے تو خیر تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اس سے نتیجہ یہ مرتب کیا کہ اسلام نے ایمان کے اشتراک سے قومیت کی تشکیل کا ایک تجربہ کیا تھا، جو ناکام ثابت ہوا۔ آپ سوچئے کہ جو شخص یہ مانتا ہو کہ اسلام کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں جس کے مطابق تجربات کامیاب بھی ہو سکتے ہیں اور ناکام بھی، بلکہ اسلام اس خدا کا عطا کردہ ضابطۂ ہدایت ہے جس کا ہر ارشاد اٹل ہے اور جس سے ہمیشہ وہ نتائج مرتب ہوں گے جن کا وہ مدعی ہے، وہ ایسی بات کبھی کہہ سکتا ہے؟ کیا عبرت انگیز ہے یہ تصور کہ (مولانا) آزاد جیسا شخص اپنی زندگی کے آخری سانس میں اسلام کے متعلق ایسی بات کہہ جائے۔

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے اسلام اور مسلمانوں کو مرادف سمجھ رکھا ہے۔ قرآن کچھ ابدی قوانین دیتا ہے جن کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جب اور جہاں بھی ان قوانین

پر عمل کیا جائے گا، فلاں قسم کے نتائج مرتب ہو جائیں گے۔ صدرِ اول میں ایک جماعت نے ان قوانین پر عمل کیا اور اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے آ گئے۔ اس جماعت کا نام جماعت مومنین (یا عرفِ عام میں مسلمان) تھا۔ اس کے بعد، اس جماعت کی نسل آگے چلی۔ انہوں نے ان قوانین پر تو عمل کرنا چھوڑ دیا لیکن نام اپنا اپنے اسلاف کی تقلید میں "مسلمان" ہی رکھا ۔۔۔ بعینہٖ جس طرح احمد حسن سبزی فروش نے اپنا نام حکیم احمد حسن رکھ چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان "مسلمانوں" کا معاشرہ ان انسانیت ساز نتائج سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا تھا جو ان قوانین پر عمل پیرا ہونے سے مرتب ہوتے تھے۔

ہم پوچھتے ہیں دانشورانِ عالم سے کہ اس ناکامی کو اسلام کی ناکامی کہا جائے گا یا مسلمان نام رکھنے والی قوم کی ناکامی؟

اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ امت کے اصلاحِ حال کی جس قدر کوششیں کی جاتی ہیں، وہ ناکام کیوں رہتی ہیں؟ اسلئے کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ مسلمان جیسے ہیں، ویسے کے ویسے ہی رہیں، لیکن ہمارے وعظ سے ان کے معاشرہ میں "اسلامی نظام" زندگی کے نتائج ظہور میں آنے شروع ہو جائیں۔ ایسا سمجھنا بھی غلط ہے اور اس مفروضہ پر کوئی کوشش کرنا بھی لاحاصل۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ حکیم احمد حسن سبزی فروش کے ہاتھوں مریض شفایاب ہو جانے تو کرنے کا کام یہ ہو گا کہ اس سے سبزی فروشی کا کاروبار چھڑا کر اسے طب کی باقاعدہ تعلیم دیں، اور جب وہ طب کی سند حاصل کر لے، تو پھر اسے حکیم کہیں، اور مریضوں کا اس سے علاج کرائیں۔ اسلام کے صدرِ اول میں طریق کار یہی تھا،

مسلمان کیسے بنتا ہے

وہاں غیر مسلموں کو، پہلے اسلامی قوانین (نظامِ حیات) کی صداقتوں سے آگاہ کیا جاتا تھا اور ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ ان پر اچھی طرح غور و فکر کر لیں۔ جب وہ غور و فکر کے بعد ان کی صداقت پر مطمئن ہو جاتے تھے تو ان کی اس کیفیت کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد انہیں اس نظام کی تعلیم دی جاتی، اور ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کی جاتی تھی۔ (وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ)۔ اس طرح جب وہ "کامل الطب والجراحت" کی سند حاصل کر لیتے تھے، تو پھر وہ معالجہ کی طرف آتے تھے۔

سوچئے کہ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی اس طرح ایمان لا کر "مسلمان" ہوا ہوا ہے؟ اس کے برعکس، کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص "حکیم احمد حسن" ہے۔ جب یہ حقیقت یہ ہے تو پھر ہم سے توقع کرنا کہ ہم اسلامی نظام کے خوشگوار نتائج کے مظہر ہوں گے، خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی غلطی ہم نے پاکستان قائم کرنے کے بعد کی۔ ہم نے ایمان کے اشتراک سے ایک امت کی تشکیل کا دعویٰ تو کیا، لیکن ایمان کسی بیا

پیدا نہ کیا۔ ہم نے بنگالی کو بنگالی، بلوچی کو بلوچی، سندھی کو سندھی، پنجابی کو پنجابی، پٹھان کو پٹھان رہنے دیا، اور فرض یہ کر لیا کہ یہ اُمتِ واحدہ ہیں کیونکہ یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ کتنی بڑی تھی یہ خود فریبی جس میں ہم نے اپنے آپ کو مبتلا رکھا ـــــ اور جس کا خمیازہ، ہم آج اس بُری طرح بھگت رہے ہیں! اس دوران میں ہم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ بنگالی کیوں غیر بنگالی کو اپنا نہیں سمجھتا، اور پٹھان کیوں ون یونٹ سے تنگ آیا ہوا ہے۔ ہم نے جب بھی علیحدگی کی کوئی آواز سنی، یا بیگانگی کے آثار دیکھے تو اس قسم کے دعظوں کو کافی سمجھا کہ

> پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، اس لئے ہماری زندگی کا نقشہ اسلام کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اسلام میں رنگ، نسل، خون، زبان کے تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں اور تمام مسلم خدا کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں ـــ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ ـــ اسلام میں اسود و احمر کی کوئی تمیز نہیں۔ اس میں بلال حبشیؓ، صہیبؓ رومی، سلمان پارسیؓ اور صدیقؓ عربی، سب ایک خاندان کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے بن جاتے ہیں۔ ہماری زندگی کا یہی شعار ہونا چاہیئے۔ ہمارے معاشرہ کا یہی انداز ہونا چاہیئے۔ ہمارا خدا ایک، کتاب ایک، رسول ایک، کلمہ ایک، قبلہ ایک، پھر ہم بھی سب ایک امت کیوں نہ ہوں۔ یاد رکھیئے۔ اتحاد میں برکت ہے، انتشار کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

جو کریگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا!

یہ وعظ کیا اور پھر لمبی تان کر سو گئے کہ سب خیر ہے۔ ہم اس طرح اپنے آپ کو فریب دیتے رہے اور ہم میں ہم آہنگی و یکے نگی پیدا ہونے کے بجائے باہمی نفرت اور کدورت کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

طلوعِ اسلام نے حصولِ پاکستان کے ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ ہم جس قسم کے مسلمان ہیں سو ہیں۔ ہم نے اس خطہ ارض کو حاصل کر لیا۔ یہ بجائے خویش بہت بڑی بات ہے، لیکن جس مقصد کے لئے اسے حاصل کیا گیا ہے (یعنی اسے اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنانا) یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہوگا۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) موجودہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ تم اس خطہ زمین کی حفاظت اس طرح سے کرو کہ دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ اور

(۱۱) اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ وہ اس انداز کے مسلمان بن کر ابھریں جس انداز کے مسلمان ہمارے صدرِ اول کے اسلاف تھے۔ اسی تعلیم سے یہ نوجوان قرآن کے اصول و انداز پر ایمان لاسکیں گے۔ اور اس طرح لائے ہوئے ایمان کے اشتراک سے وحدتِ امت کے امکان روشن ہوتے چلے جائینگے، اور رفتہ رفتہ ایسی کیفیت پیدا ہوسکیگی کہ ہم نہ بنگالی رہیں نہ بلوچی، نہ پنجابی رہیں نہ افغان، بلکہ صرف پاکستانی رہیں۔ اور اس سے آگے چل کر یہ توقع بھی ہوسکے گی کہ ہم نہ شیعہ رہیں نہ سنی۔ نہ وہابی رہیں نہ حنفی۔ بلکہ صرف مسلمان بن جائیں۔ ان مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نتائج مرتب ہوسکینگے جن کا وعدہ اسلام کرتا ہے، اور جو وعدہ یقینی اور اٹل ہے۔ اسلامی نظام نے جو کچھ ایک دفعہ کرکے دکھایا تھا، اس میں وہی کچھ کر دکھلانے کی ابدی صلاحیت ہے جس طرح فطرت کا کوئی قانون کبھی فیل نہیں ہوتا، اسی طرح قرآن کا کوئی اصول بھی کبھی ناکام ثابت نہیں ہوسکتا، کہ یہ دونوں اس خدا کے تخلیق کردہ ہیں جس کا علم ازلی اور ابدی ہے، تجارب کا محتاج نہیں۔

جماعتِ اسلامی کا اعتراض

اس مقام پر ضمناً ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات آج کل بڑے فخر سے کہتے پھر رہے ہیں کہ دیکھا! مودودی صاحب نے جو کچھ ۱۹۳۸-۳۹ء میں کہا تھا وہ کیسے حرف بحرف صحیح ثابت ہوا؟ انہوں نے کہا تھا کہ ان پیدائشی مسلمانوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ اسلامی نظام قائم کرسکیں گے، قطعاً غلط ہے۔ مودودی صاحب کی بات کسی نے نہ سنی، لیکن واقعات نے اسے سچا ثابت کر دکھایا۔

مودودی صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس میں اتنی بات تو صحیح تھی کہ موجودہ مسلمان، اسلامی نظام قائم نہیں کرسکینگے، لیکن اس کے بعد، وہ قوم کو جس راستے پر ڈالنا چاہتے تھے وہ تباہیوں کی طرف لے جانے والا تھا۔ اُس وقت ہندوستان کا سیاسی نقشہ یہ تھا کہ انگریز وہاں سے جا رہا تھا۔ ہندو کی کوشش تھی کہ وہ جاتے وقت، زمامِ اقتدار (جمہوریت کے نقاب میں) ان کے حوالے کر جائے۔ اگر ایسا ہوجاتا، تو مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندو کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے رہتے۔ قائداعظم کی کوشش یہ تھی کہ وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوستان سے الگ کردیئے جائیں تاکہ ان میں مسلمان اپنی آزاد حکومت قائم کرسکیں۔ اور پھر اس حکومت کو رفتہ رفتہ اسلامی بنا لیا جائے۔ یہ تھی وہ کشمکش جس میں مسلمان کا سیاسی مستقبل گرفتار تھا۔ ایسے نازک وقت میں، مودودی صاحب یہ پٹی پڑھا رہے تھے کہ موجودہ مسلمان اس قابل ہی نہیں کہ وہ اسلامی حکومت قائم کرسکیں۔ اس لئے ان کے لئے الگ آزاد خطۂ زمین کا مطالبہ غیر اسلامی ہے۔ ہمیں اس مطالبہ کو چھوڑ کر مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی فکر کرنی چاہیئے

جب یہ مسلمان ہو جائیں گے تو ـــ یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم بھی ان کے قبضے میں آجائیں گے۔

اب سوچئے کہ اگر اُس وقت ان کی بات مان کر پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیا جاتا، تو انگریز کے جانے کے بعد، پورا ہندوستان، ہندوؤں کے زیرِ اقتدار آجاتا۔ اور پھر وہاں ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو وہاں رہ جانے والے مسلمانوں کا حشر ہو رہا ہے ـــ وہاں ہم چار کروڑ ہوتے یا سات کروڑ، اس سے کچھ فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ مسلمان مودودی صاحب کے اس مقدس فریب میں نہ آسکے۔ ورنہ یہ ہندوؤں کے ہاتھوں بے دریغ ذبح ہوتے اور باہر کی دنیا تک ان کی چیخ و پکار پہنچانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔

اگر مودودی صاحب نیک نیتی سے سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ـــ ہندوؤں کے سیاسی اقتدار کے علی الرغم ـــ مسلمان بنایا جاسکتا ہے جس سے وہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندوؤں پر غالب آجائیں، تو سوال یہ ہے کہ وہ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان سے بھاگ کیوں آئے ـــ ہندوستان میں اُس وقت، چار پانچ کروڑ مسلمان باقی تھے۔ انہوں نے وہاں انہیں مسلمان بنانے کی مہم کیوں نہ شروع کی۔

اور اگر (محض بطور عذرِ لنگ) یہ کہا جائے کہ تقسیم نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ وہاں کے مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی مہم شروع نہیں کی جاسکتی تھی، تو دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انہوں نے، پاکستان آکر، یہاں کے مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی مہم کیوں نہ شروع کی؟ اس میں کون سا امر مانع تھا؟ یہ تھا وہ سوال جو خود جماعتِ اسلامی کے اکابرین کی ایک کھیپ نے اٹھایا۔ اور جب، اس کے جواب میں، مودودی صاحب نے 'اصول پرستی کی جگہ حکمتِ عملی' کو اسلامی تقاضا بنایا، تو وہ (۱۹۵۵ء میں) جماعت کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ اور جماعت نے انہیں کوسنا شروع کر دیا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مودودی صاحب جو کچھ ۳۹-۱۹۳۸ء میں فرماتے تھے، اس سے مقصود مسلمانوں کو مسلمان بنانا نہیں تھا۔ دراصل اس کی آڑ میں مطالبۂ پاکستان کی اسکیم کو ناکام بنانا تھا۔ اس کے برعکس، تحریکِ پاکستان کے دوران، طلوعِ اسلام کا مسلک یہ تھا کہ اس وقت سیاسی کشمکش نے جس مقام پر ہمیں کھڑا کر دیا ہے اس میں کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں کو ہندوستان سے علیحدہ کر کے، مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنانے کی مہم شروع کر دی جائے۔ تاکہ رفتہ رفتہ یہ آزاد مملکت، اسلامی مملکت بن جائے۔ اس کے نزدیک اس کا طریقہ نئی نسلوں کے لئے صحیح تعلیم کا نظام تھا۔ ہم اپنے اس پیغام کو تیئیس سال سے مسلسل عام

کرتے چلے آرہے ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ کرنا ہماری بساط میں نہیں تھا۔ طلوع اسلام، نہ تو (مولانا) آزاد کی طرح، اسلام ہی کی طرف سے مایوس ہے، اور نہ ہی مودودی صاحب کی طرح، اصولوں کو چھوڑ کر حکمتِ عملی کا قائل۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کا ایمان ہے کہ اسلام نے جو کچھ ایک دفعہ کر دکھایا تھا اس میں ہر زمانے میں وہی کچھ کر دکھانے کی صلاحیت موجود ہے — اور اس کی یہ صلاحیت ابدی اور غیر متبدل ہے۔ ہمیں مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب ہم اسلام اور مسلمانوں کو مرادف سمجھ لیتے ہیں، اور مسلمانوں کی ناکامیوں اور حرماں نصیبیوں کو اسلام کی شکست قرار دے دیتے ہیں۔ جو حضرات (پاکستان ہی کی نہیں بلکہ عالمگیر) "ملتِ اسلامیہ" کے اصلاحِ حال کا درد اپنے سینے میں رکھتے ہیں، ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اسلام اور موجودہ مسلمانوں کے اس فرق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کوئی قدم اٹھائیں۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ، صدرِ اول کے بعد کی تاریخ کو اسلام کی تاریخ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ سمجھیں۔ اگر قوم کی قسمت نے کبھی پلٹا کھایا تو اس کے لئے یہ بھی کرنے کا کام ہوگا کہ اسلام کی تاریخ کو مسلمانوں کی تاریخ سے الگ کر کے، از سرِ نو مرتب کریں۔ اس سے وہ تمام الجھنیں دور ہو جائیں گی جو اس وقت قدم قدم پر ہمارے لئے وجہِ اضطراب بنتی رہتی ہیں۔ اور پھر ہمیں مایوسی کی تاریکیوں میں دھکیل دیتی ہیں۔

(۰)

موجودہ سیاسی حالت کا جائزہ

ان تصریحات کی روشنی میں ہمیں پاکستان کی موجودہ سیاست کا جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں، مختلف خطوں، صوبوں، گروہوں، پارٹیوں اور طبقوں میں باہمی تعصب کے جذبات بڑی شدت اختیار کر چکے ہیں، حتیٰ کہ اکثر ذہنوں میں علیحدگی تک کے خیالات پرورش پانے لگ گئے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ان اسباب و علل کا حقیقت پسندانہ نگاہ سے سراغ لگائیں جن کی وجہ سے حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے، ہم یہ کہہ کر شترِ مرغ کی طرح اپنا سر ریت میں چھپا لیتے ہیں کہ مشرق ہو یا مغرب، سندھ ہو یا بلوچستان، ہم سب اسلام کے فرزند ہیں اور اسلام محبت اور اخوت، اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ نفرت و عداوت اور تشتت و انتشار کی۔ لہٰذا فرزندانِ توحید کے دل میں باہمی تعصب و نفرت یا بیگانگی اور علیحدگی کے خیالات پیدا ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ ہم ان ہزاروں بار کے دہرائے ہوئے الفاظ کو بار بار دہرا دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ تمام اختلافی مسائل حل ہو گئے۔ یہ اندازِ نگاہ غلط ہے جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے۔ جب ہم نے یہاں اسلامی ذہنیت ہی پیدا نہیں کی تو ان معاملات کے سلجھانے کے لئے اسلام کے نام کی اپیل کس طرح نتیجہ خیز ہو سکتی ہے؟ ہمیں ایسا کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ یہ فریبِ نفس ہے۔

جس سیاسی بگولے میں اس وقت ہمارا ملک پھنس چکا ہے، ہمارے نزدیک یہ اس سے اسی صورت میں صحت و سلامتی سے نکل سکتا ہے کہ اس کا نظام حسب ذیل خطوط پر تشکیل ہو۔

(۱) اس مملکت کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ غیر مسلم اور مسلمان مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ غیر مسلم اس ملک میں ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے جسے مملکت کے قانون سازی وغیرہ کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ البتہ ان کے انسانی حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا، پاکستانی غیر مسلموں کو ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کا حصہ قرار نہ دیا جائے۔

(۲) پوری مملکت کی حکومت وحدانی ہو جس کے نظم و نسق کے لئے اسے مختلف کمشنریوں میں تقسیم کر دیا جائے اور صوبوں کی امتیازی حدود ختم کر دی جائیں۔ ان کمشنریوں کو ایسے اختیارات حاصل ہوں کہ عوام کے معاملات وہیں کے وہیں طے ہو جایا کریں۔ سابقہ ون یونٹ کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں کو ذرا ذرا سی بات کے لئے لاہور آنا اور دفتروں کے چکر کاٹنا پڑتے تھے۔

(۳) مملکت کا نظام صدارتی ہو اور پارلیمان اور صدر کے حدودِ اختیارات متعین کر دیئے جائیں۔

اس سے ملک کم از کم اس آتش فشاں پہاڑ میں گرنے سے بچ جائے گا جس کے دھانے پر اسے اس وقت لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ یہ سارا کھیل چند دنوں میں ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد (خاکم بدہن)

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

لیکن اگر مندرجہ بالا سیاسی تبدیلیوں سے ملک محفوظ بھی کر لیا گیا تو بھی یہ اسلامی مملکت نہیں بن سکے گا۔ اس کے اسلامی مملکت بننے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے نظامِ تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کی جائے جس سے یہ نوجوان صرف مسلمان بن کر ابھریں ـــــ صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے انداز کے مسلمان۔

لیکن اس قسم کا جرأت مندانہ اقدام کوئی ایسا مردِ قلندر ہی کر سکتا ہے جو اپنی امانت و دیانت اور خلوص و بلندیٔ کردار کی بنا پر قوم کے دل میں ایسا اعتماد پیدا کر چکا ہو کہ اس کے فیصلوں کے سامنے قوم بطیبِ خاطر سر جھکا دے۔

اگر ہمارے نظامِ تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی نہ ہوئی تو، مملکت کا اسلامی بننا تو درکنار، آپ دیکھیں گے کہ یہاں "کتاب و سنت" کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین بھی مرتب نہیں ہو سکے گا جس کا اطلاق یہاں کے تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے ـــــ اگر اس کا تجربہ کرنا ہو تو آپ مختلف فرقوں کے علماء سے

کہئے کہ وہ باہمی مل بیٹھ کر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر کے دکھائیں! آپ دیکھیں گے کہ ایسا ضابطہ مرتب کرنا تو ایک طرف، وہ چار دن ایک کمرے میں اکٹھے بیٹھ بھی نہیں سکیں گے۔ آپ جماعت اسلامی سے کہئے کہ وہ ایسا کرکے دکھائے۔ ان کے دعوائے اسلامی نظام کی قلعی کھل جائیگی۔

(۰)

یہ ہے وہ آئینہ جسے ہم قوم کے سامنے رکھنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر اسے پتھر پر دے مارنے کے بجائے اپنے خط و خال کی درستگی کی طرف توجہ دے اور اس طرح اس مظلوم ملک کی حالت پر رحم کھائے!

(۰)

بقیہ "یومِ آزادی کی روح پرور تقریب" صفحہ ۱۸ سے مسلسل

حضور نبی اکرم نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اسی طرح سے یہ دوبارہ قائم ہو سکتا ہے۔

قریب دو گھنٹے کے اس نہایت مدلل اور حقیقت کشا قرآنی خطاب کے بعد سامعین سے سوالات کیلئے کہا گیا اور پرویز صاحب نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں ان کے مسکت جوابات دیئے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب یہ روح پرور تقریب بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

(۰)

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن

اپنے روایتی حسن و سادگی اور صحت مندانہ آب و تاب کے ساتھ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں منعقد ہو رہی ہے۔ تواریخ اور پروگرام کے متعلق آئندہ ماہ کے طلوعِ اسلام میں اعلان کیا جائیگا۔ ہنگامہ خیزیوں سے شرابور فضا میں اس قسم کے خالص فکری اور سنجیدہ اجتماع کی جو اہمیت ہو سکتی ہے اسکا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کنونشن بگولوں کے نرغے میں گھری ہوئی قوم کی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کی کوشش کریگی۔

ناظم

ہم کس کا ساتھ دیں؟

انتخابات کی گہما گہمی کے سلسلہ میں، ہمارے ہاں اس قسم کے سوالات کا تانتا بندھ رہا ہے کہ ہم کس کا ساتھ دیں؟ جو حضرات انتخابات میں بطور امیدوار کھڑا ہونا چاہتے ہیں، وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں؟ ووٹ دینے والے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کس پارٹی کے امیدوار کے حق میں ووٹ دیں۔

یہ واضح ہے کہ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے — وہ امت کے پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانے کو از روئے قرآن جائز ہی نہیں سمجھتا — نہ ہی ہم عملی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں۔ لہٰذا، اس قسم کے سوالات کے سلسلہ میں ہم جو کچھ عرض کریں گے وہ ہماری قرآنی بصیرت کی روشنی میں مشورۃً ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جو احباب دل میں پاکستان کا درد اور ملت کی بہی خواہی کا احساس رکھتے ہیں، وہ اگر آزاد امیدوار کی حیثیت سے اسمبلی میں جائیں تو کچھ مفید کام کر سکیں گے۔ پارٹی ٹکٹ پر منتخب ہونے سے، یہ رکن اپنی آزادی پارٹی کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ اسے پارٹی کے ہر فیصلہ کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ خواہ وہ فیصلہ اس کے خیال میں غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ آزاد امیدوار، کم از کم اپنی آزادی برقرار رکھتا ہے اور پیش آمدہ معاملات میں، تائید اس کی کرتا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے، اور جسے غلط سمجھتا ہے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر ایوانات میں اس قسم کے آزاد امیدوار وزنی حیثیت حاصل کر لیں تو وہ فیصلوں کا رُخ بدلنے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

جہاں تک رائے دہندگان کا تعلق ہے، ان سے بھی ہمارا مشورہ یہی ہے کہ وہ پارٹیوں سے قطع نظر ایسے آزاد امیدوار کے حق میں ووٹ دیں جس کی دیانت و امانت اور فراست و بصیرت ان کے نزدیک قابلِ اعتماد ہو۔ ووٹ دینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس شخص کو جس کے حق میں آپ ووٹ دیتے ہیں، اپنا نمائندہ مقرر کرتے ہیں۔ نمائندہ مقرر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایوان میں جو معاملہ زیر نظر ہو، اس میں وہ شخص جو کچھ کرے یا کہے، وہ اسکا ہیں

بلکہ خود آپ کا قول اور فعل سمجھا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر آپ کے نمائندہ کا قول و فعل خود آپ کا قول و فعل قرار پائے گا۔ بس اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ آپ کے ووٹ دینے کا عملی مفہوم کیا ہے۔

۲۔ بعض حضرات کہتے ہیں (اور یہ گروہ زیادہ تر گرمجوش نوجوانوں پر مشتمل ہے) کہ جس معاشی نظام کیلئے طلوعِ اسلام برسوں سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہے، پیپلز پارٹی اسی نظام کے قیام کے لئے مصروفِ جدوجہد ہے۔ اس لئے طلوعِ اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس پارٹی کا ساتھ دے۔ جیسا کہ (متعدد بار) کہا جا چکا ہے طلوعِ اسلام پارٹیوں کی کشمکش میں نہیں الجھتا لیکن چونکہ ان استفسارات میں ایک پارٹی کا خاص طور پر نام لے کر سوال کیا جاتا ہے اسلئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس بارے میں اپنی پوزیشن واضح کر دی جائے۔

جس وقت سے پیپلز پارٹی وجود میں آئی ہے آپ اس وقت سے آج تک کے طلوعِ اسلام کے پرچے سامنے رکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم ان حضرات سے مسلسل کہتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ سوشلزم سے ان کی مراد کیا ہے، اور جب وہ "اسلامی سوشلزم" کہتے ہیں تو اس میں اور "سوشلزم" میں فرق کیا ہے؟ — یا اسلامی سوشلزم اور غیر اسلامی سوشلزم میں کیا فرق ہے؟ ان حضرات کی طرف سے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ انہوں نے کیا ہے تو صرف اتنا کہ "اسلامی سوشلزم" کے ساتھ "مساواتِ محمدی" یا "خلافتِ راشدہ کا معاشی نظام" جیسی مزید اصطلاحات کا اضافہ کر دیا ہے — یاد رکھئے۔ ہمارے ہاں کے موجودہ خلفشار کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں لیکن ان کی وضاحت کبھی نہیں کی جاتی۔ عصرِ حاضر کی میکیاولی سیاست کا گُر یہ ہے کہ نہایت خوشنما، دلفریب لیکن مبہم اصطلاحات پیش کر کے عوام کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کرتے جاؤ لیکن ان اصطلاحات کی وضاحت کر کے اپنے آپ کو (COMMIT) مت کرو۔ اس سے پہلے مذہبی جماعتوں کی طرف سے اقامتِ دین، حکومتِ الٰہیہ، اسلامی نظام، احکامِ شریعت جیسی مبہم اصطلاحات سے عوام کو اپنے پیچھے لگایا جاتا رہا — اور لگایا جا رہا ہے — اس کے بعد اس فہرست میں "جمہوریت" جیسی اصطلاح کا اضافہ ہوا۔ پھر مسٹر بھٹو نے اپنے اقنومِ ثلاثہ پیش کئے کہ — اسلام ہمارا مذہب، جمہوریت ہماری سیاست، اور سوشلزم ہماری معیشت — پھر سوشلزم کے ساتھ اسلامی کا اضافہ کیا گیا۔ پھر اسلامی سوشلزم عرف مساواتِ محمدی، عرف اسلام کا معاشی نظام وغیرہ — نعرے فضا میں بلند ہوئے۔ نہ مذہب کے اجارہ داروں نے قوم کو واضح الفاظ میں بتایا کہ اقامتِ دین سے ان کی مراد کیا ہے اور نہ ہی ان کے مخالفین کی طرف سے قوم کو یہ بتایا گیا کہ سوشلزم، اسلامی سوشلزم، یا مساواتِ محمدیہ کا متعین مفہوم کیا ہے۔

طلوعِ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کی کہ روس اور چین کی طرف سے پیش کردہ سوشلزم مرکب ہے دو لاینفک اجزاء سے — یعنی ایک وہ فلسفۂ زندگی جو ان کے نزدیک ان کے نظامِ معیشت کی بنیاد ہے اور

دوسرا وہ معاشی نظام جسے انہوں نے اپنے ہاں رائج کیا ہے یا رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فلسفۂ زندگی ' خدا، رسول، وحی، آخرت کے انکار کا دوسرا نام ہے اور ظاہر ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کا ماننے والا کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ البتہ جو معاشی نظام انہوں نے پیش کیا ہے وہ قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ ہم نے "اسلامی سوشلزم" کے مدعیان کی خدمت میں گزارش کیا کہ وہ کم از کم اتنا ہی اعلان کر دیں کہ ہم سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کو ملعون و مردود قرار دیتے ہیں اور جس معاشی نظام کے لئے ہم جد و جہد کرتے ہیں اس سے مراد قرآن کا وہ معاشی نظام ہے جس کی بنیاد قرآن کے متعین کردہ فلسفۂ زندگی پر ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے آج تک اتنا بھی نہیں کیا۔ انہوں نے سوشلزم کی "ازم" یعنی اس کے فلسفۂ زندگی کو کہیں ملعون و مردود نہیں ٹھہرایا ___ اسکے باوجود ہم نے ان حضرات کو کافر و ملحد قرار نہیں دیا، بلکہ یہ کہہ کر کہ انہوں نے سوشلزم کی اصطلاح اختیار کر کے ایک اجتہادی غلطی کی ارباب محض اپنی بات کی پچ پر اڑے ہوتے ہیں' ان کے متعلق بہر نوع حسن ظن سے کام لیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس حسن ظن کی بنا پر ان کے مؤقف کی تائید کرنے لگ جائیں۔ جب تک یہ حضرات متعین طور پر نہیں بتائیں گے کہ اسلامی سوشلزم سے ان کی مراد کیا ہے اور وہ "سوشلزم" سے کس طرح مختلف ہے ___ یا "اسلامی سوشلزم" کسے کہتے ہیں اور غیر اسلامی سوشلزم کسے ___ اس وقت تک ہم ان کے مؤقف کی صحت و سقم کے متعلق نہ صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں نہ ان کی تائید میں کچھ کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ طلوعِ اسلام کی طرف سے کسی کی تائید و تردید سے مراد کیا ہے اور اسکے نتائج کس قدر دور رس ہوتے ہیں؟ (اللہ کا شکر ہے کہ آج) ملک میں بکثرت ایسے حضرات موجود ہیں جو مسائل زندگی میں طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ فکر کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ فکر قرآنی تعلیم کی روشنی میں پیش کی گئی ہے' اور اس کے بعد' وہ اسکے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے بعد آپ سوچئے کہ کسی مسلک کی تائید یا مخالفت سے طلوعِ اسلام کس قدر عظیم ذمہ داری اپنے سر پر لیتا ہے۔ ہمارا سر نیاز بارگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے کہ بڑے سے بڑے لالچ اور مہیب سے مہیب خوف نے بھی' آج تک کبھی اس ذمہ داری کے احساس سے ہمیں غافل نہیں ہونے دیا۔ کسی بات کے سمجھنے میں غلطی کر جانا اور بات ہے لیکن خدا کا احسان ہے کہ جس بات کو ہم نے قرآن کریم کی روشنی میں حق سمجھا ہے' اس کا ہم نے بلا خوفِ لائمۃ لائم' پورے زور و شور سے اعلان کیا ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کی بھی اسی شدت سے مخالفت کی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک!

۳۔ کہا یہ جاتا ہے کہ "اسلامی سوشلزم" سے مراد وہی ہے جسے علامہ اقبالؒ نے (بالشوزم + خدا = اسلام) کی مساوات (EQUATION) سے تعبیر کیا تھا۔ ایسے کہنے والے حضرات کو غالباً اس کا علم نہیں کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس فارمولا (یا "مساوات") کو علیٰ حالہٖ غیر مبہم نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے بڑی شرح و بسط سے اس کی وضاحت بھی کی تھی کہ (+ خدا) سے ان کا مطلب کیا ہے۔ آپ جاوید نامہ میں' وہ باب دیکھئے جس میں انہوں نے

ملت روسیہ سے خطاب کیا ہے۔ آپ کو نظر آجائیگا کہ انہوں نے سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کی کس شدت سے مخالفت کی ہے اور اسکے بعد کس حتم و یقین کے ساتھ کہا ہے کہ جب تک اس اقتصادی نظام کو خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی بنیادوں پر استوار نہیں کیا جاتا، نہ صرف یہ کہ یہ نظام نوع انسانیہ کے لئے منفعت بخش نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ممکن العمل بھی نہیں ہوگا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کے واضعین نے اس کی بھی کہیں اسی طرح وضاحت کی ہے؟ وضاحت کے یہ معنی نہیں کہ ان کے فلاں لیڈر نے اپنی فلاں تقریر میں یہ کہا ہے اور فلاں نے یہ۔ پارٹیوں کے موقف کی وضاحت ان کے منشور میں کی جاتی ہے۔ اور (جہاں تک ہمارے علم میں ہے) پیپلز پارٹی نے ابھی تک اپنا منشور ہی شائع نہیں کیا، چہ جائیکہ اس میں اس اصطلاح کی وضاحت کی گئی ہو۔ تقاریر اور بیانات میں یہ کہتے جانا کہ ہم زمینداروں سے زمینیں چھین لینگے۔ کارخانہ داروں سے کارخانے لے لئے جائینگے، دولت کو جمع نہیں ہونے دیا جائیگا، وغیرہ وغیرہ۔ نعرہ بازی کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن بات تو یہ بتانے کی ہے کہ ان زمینوں، کارخانوں جائیدادوں کو چھین کر دیا کن کے ہاتھوں میں جائیگا؟ ان کے انتظام کی شکل کیا ہوگی۔ وہ کون سا پروگرام ہوگا جس کی رو سے، مزدور، کاشتکار، عوام اس دولت کے مالک بنا دیئے جائینگے۔ اس کی ضمانت کیا ہے کہ ملک میں واقعی کوئی بھوکا نہیں رہے گا۔ کوئی ننگا نہیں رہے گا۔ ہر ایک کو مکان مل جائیگا۔ ہر ایک کے علاج معالجہ، تعلیم کا انتظام ہوگا۔ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ کس طرح ہوگی؟ محنت کا معاوضہ کس معیار کے مطابق متعین کیا جائیگا۔ کون یہ معیار مقرر کریگا۔ وہ جذبہ محرکہ کیا ہوگا جس کی رو سے زیادہ کمانے والے اپنی کمائی کا زائد از ضروریات حصہ دوسروں کیلئے دیدیں وغیرہ وغیرہ۔ جب تک ان اور ان جیسے دیگر متعلقہ سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں دیا جاتا، خود سوشلزم کی اصطلاح مبہم رہ جاتی ہے چہ جائیکہ اسلامی سوشلزم کی حقیقت سامنے آسکے! اس کے ساتھ اللہ نہایت ضروری ہے۔ یہ حضرات اس قسم کے وعدے کر رہے ہیں اور ہمیں یہ خطرہ ستا رہا ہے کہ اگر یہ برسر اقتدار آگئے اور ان وعدوں کو پورا نہ کر سکے (جو ظاہر ہے کہ راتوں رات کبھی پورے نہیں ہو سکینگے) تو عوام ہر طرف سے مایوس ہو جائینگے، اور پھر ملک میں وہ خلفشار مچیگا جو کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ ابلیس مایوسی کا نمائندہ ہے اور شیطان سرکشی کا پیکر۔ ناکامی کا پہلا ردعمل مایوسی ہوتا ہے اور اسکے بعد سرکشی ــــ مایوس کی سرکشی جس قسم کی تخریبی ہوتی ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا بجائے اسکے کہ عوام کو نگاہ فریب نعروں میں الجھا کر پاپولیریٹی حاصل کیجائے تقاضائے تدبر یہ ہے کہ ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور و امکان کا اطمینان بخش حل تلاش کیا جائے اور پھر عوام کو سنہرے خوابوں کے بجائے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنا سکھایا جائے۔ نظام سرمایہ داری کی جگہ صحیح نظام معیشت اسی طرح لایا جا سکتا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ ہم سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے نتائج سے چھٹکارا حاصل کرتے کرتے، جذبات پرستی کے سراب

میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس کے لئے بڑے حسنِ تدبر کی ضرورت ہے۔ یہ مقصد مبہم اصطلاحات سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

بہرحال 'طلوعِ اسلام' مبہم اصطلاحات کی تائید سے ہزارہا بندگانِ خدا کی آراء کو متاثر کرنے کی ذمہ داری کے احساس سے لرزاں ہے۔ اس نے اسکا جواب اپنے خدا کے حضور دینا ہے محض پاپولر بننا اسکے پیشِ نظر نہیں۔

۴۔ اسکے ساتھ ہی ایک اور حقیقت کا سامنے رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت، معاشی نظام تک محدود نہیں۔ اس کی دعوت یہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری کی پوری زندگی قرآنی حدود و قیود کے تابع بسر ہو۔ اسی کا نام اسلامی نظام ہے جس کا ایک گوشہ معاشی نظام ہے۔ طلوعِ اسلام بارہا اس حقیقت کو واضح کر چکا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، دین کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ دین، نظامِ حیات کا یوں سمجھئے کہ، ایک فارمولا ہے اور فارمولا اپنے نتائج اسی صورت میں مرتب کر سکتا ہے جب اسے بتمام عمل میں لایا جائے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ "جو لوگ کتابِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے"، تو اس میں زندگی کے کسی ایک شعبہ کو قرآن کے تابع لانے کو ایمان یا اسلام نہیں قرار دیا گیا۔ پوری کی پوری زندگی پر اسکی حکمرانی کو ایمان کہا گیا ہے۔

اب قرآن کے اس اصول کی روشنی میں مسئلہ زیرِ نظر کا جائزہ لیجئے۔ ظاہر ہے کہ انتخابات کے بعد جو پارٹی بھی صاحبِ اقتدار ہو گی وہ اپنی حکومت قائم کرے گی۔ حتیٰ کہ اگر سوشلسٹ پارٹی بھی برسرِ اقتدار آ گئی تو یہ نہیں ہو گا کہ وہ اپنے اقتدار کو صرف معاشی پروگرام تک محدود رکھے۔ اسے حکومت کے ہر شعبہ کا نظم و نسق کرنا ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس پارٹی نے کہیں اس کا اعلان کیا ہے کہ وہ برسرِ اقتدار آ گئی تو قرآن کی حکمرانی قائم کرے گی؟ سوشلسٹ پارٹی تو ایک طرف، ایسا اعلان ملک کی کسی پارٹی نے بھی نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی طلوعِ اسلام کی تائیدِ کلی حاصل نہیں۔ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ جو بات قرآن کے مطابق ہو وہ کسی فرد، کسی فرقہ، کسی پارٹی، کسی گروہ حتیٰ کہ کسی حکومت کی طرف سے اُٹھے طلوعِ اسلام اس بات کی تائید کرے گا۔ اور جو بات قرآن کے خلاف ہو وہ کسی کی طرف سے بھی باہر کیوں نہ آئے، وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ (ضمناً بعض گوشوں کی طرف سے جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ دیکھئے طلوعِ اسلام نے فلاں حکومت کی حمایت کی تھی، تو ایسا کہنے والے یا تو حقیقت سے باخبر نہیں ہوتے یا دانستہ عوام کو دھوکا دیتے اور اشتعال دلاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام نے آج تک نہ کسی حکومت کی بہ حیثیتِ مجموعی حمایت کی ہے، نہ مخالفت۔ اسکا مسلک یہ رہا ہے کہ اگر کسی بدترین حکومت کی طرف سے بھی ایسا اقدام ہوا ہے جو اسکے نزدیک قرآن کے مطابق تھا، اس نے اسکی تائید و تحسین میں کبھی بخل نہیں برتا۔ اور اگر کسی اچھی سے اچھی حکومت کی طرف سے بھی ایسی بات سرزد ہوئی ہے جو اسکے نزدیک قرآن کے خلاف تھی تو اس نے اس کی مخالفت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھائی۔)

طلوعِ اسلام کا یہی مسلک پارٹیوں اور گروہوں کے سلسلہ میں بھی ہے۔ قرآن کے مطابق آواز کسی طرف سے

بھی اُٹھے وہ اس بات کی تائید کریگا اور جو بات قرآن کے خلاف ہوگی وہ اس کی مخالفت کریگا۔ البتہ اسکی کلی تائید صرف اس کے ساتھ ہوگی جو اس کا اعلان کرے (جیسا کہ قائداعظمؒ نے اعلان کیا تھا) کہ

> اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو ہم ملک میں ایسا نظام قائم کرینگے جس میں اطاعت صرف خدا کی ہوگی جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ خدا کی اس کتابِ عظیم کے قوانین و اصول ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرینگے۔ اس نظام میں حکمرانی صرف قرآنی اصول و احکام کی ہوگی۔ مملکت ان اصول و احکام کے نافذ کرنے کی ایجنسی ہوگی اور بس۔

جو جماعت بخت اسکا اعلان کرے، وہی حق پر ہوگا اور اسی کو طلوعِ اسلام کی کلی حمایت حاصل ہوگی۔

۴۔ اور آخری بات یہ کہ یہ اقتدار بھی پُرامن آئینی طریق سے حاصل کیا جائیگا۔ فسادانگیزیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے تشدد سے نہیں۔ کسی قوم کو قانون شکنی پر ابھارنے یا فساد انگیزیوں پر اسکی پیٹھ ٹھونکنے کے جو نتائج ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس مختصر سی حکایت سے لگ سکتا ہے جسے ہم بچپن میں سنا کرتے تھے کہ ایک لاڈلے بچے نے بازار میں کسی کو گالی دی تو اس نے اُسے شاباش بھی دی اور دو پیسے کی مٹھائی بھی لے دی۔ کسی دیکھنے والے نے اس سے کہا کہ تم نے یہ کیا کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اسکا نتیجہ تھوڑے ہی دنوں میں خود اس لاڈلے کے اور ان میاں صاحب کے سامنے آجائیگا جنہوں نے اپنے چاہیتے کو گالیاں دینا سکھایا ہے۔ دوسرے یا تیسرے دن اس بچے نے کسی اور کو گالی دیدی تو اس نے ایسا لیرجما دیا کہ اسے تین دفعہ غش آیا اور بڑے میاں کو ہفتہ بھر اس کا علاج کرانا پڑا ۔۔۔ جب ۶۹-۱۹۶۸ء میں ہمارے لیڈران کرام، قوم کو ہنگامہ خیزیوں پر اُکسا رہے تھے تو ہم نے انکی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ عوام (بالخصوص نوجوانوں) کو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خوگر نہ بنائیے اس سے ملک کی بھی تباہی ہوگی اور خود آپ کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ لیکن اس تنبیہ پر کسی نے کان نہ دھرا ۔۔۔ نہ صرف یہ کہ اسے ان سُنی کر دیا بلکہ بعض گوشوں سے یہ بھی کہا گیا کہ طلوعِ اسلام ایک غلط حکومت کی حمایت کرتا ہے حالانکہ طلوعِ اسلام غلط حکومت کی حمایت نہیں کرتا تھا بلکہ غلط حکومت کو بدلنے کے غلط طریق کار کی مخالفت کرتا تھا ۔۔۔ بہرحال اس تنبیہ پر کسی نے کان نہ دھرا۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ایک پارٹی کا جلسہ ہوتا ہے، یا جلوس نکلتا ہے تو دوسری پارٹی کے مجاہدین صف شکن ڈنڈے لیکر پہنچ جاتے ہیں اور خون خرابہ شروع ہو جاتا ہے۔ ڈنڈے چلانے والوں کی پارٹی تعلیں بجاتی ہے لیکن دوسرے ہی دن جب فریق مقابل کے ڈنڈے بازان پر حملہ کرتے ہیں تو یہ دہائی دینے لگ جاتی ہے اور حکومت تک سے اپیلیں کرتی ہے کہ خدا کیلئے امن قائم کیجیے۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیے۔ اب انہیں کون بتائے کہ

ایں باد صبا ہمہ آوردۂ تست!

اور ان ہنگامہ آرائیوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں جرائم عام ہو رہے ہیں۔ کسی کی جان، مال، عزت، آبرو، عفت و عصمت محفوظ نہیں رہی۔ امن پسند شہری لرزاں و ترساں زندگی کے دن گزار رہے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ملک دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جا رہا ہے ۔۔۔ لہٰذا طلوعِ اسلام ایسے طریق کار کی حمایت کس طرح کر سکتا ہے جس کے نتائج یہ ہوں!۔۔۔ یہ ہے طلوعِ اسلام کا موقف اور یہ ہے مستفسرین سے اسکا مشورہ۔ فہل من مدکر!

(✱)

یومِ آزادی کی رُوح پرور تقریب

۱۴ اگست کی شب بزم طلوع اسلام راولپنڈی نے 'یوم آزادی' کی تقریب کے سلسلہ میں ایک جلسہ عام کا اہتمام کیا۔ اس دن شہر میں مختلف تقاریب تھیں لیکن گارڈن کالج کا وسیع و عریض ہال (جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا) اہالیانِ راولپنڈی کے حسنِ ذوق اور قرآنی فکر سے وابستگی کا آئینہ دار تھا۔ جلسہ کا آغاز اعلان کے مطابق ٹھیک آٹھ بجے تلاوتِ قرآن کریم سے ہوا۔ طلوع اسلام کے معمول کے مطابق کرسی صدارت پر بزم راولپنڈی کے نمائندہ جناب [illegible] صاحب رونق افروز تھے اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض بزم کے رکن، ظہور الحق صاحب سرانجام دے رہے تھے۔ عزیز احمد قریشی صاحب نے تحریک طلوع اسلام کا تعارف کرایا جس کے بعد پرویز صاحب نے اپنے خطاب کا آغاز کیا جس کا عنوان تھا —— "دین کی تحریکِ تفہیم" —— انہوں نے نہایتا قوموں کی زندگی میں آزادی کی اہمیت اور حصولِ پاکستان کے معرکہ آرا کارنامہ کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا کہ ہندو کے نزدیک آزادی سے مفہوم فقط اتنا تھا کہ ہندوستان سے انگریز چلا جائے اور زمامِ اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں آ جائے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک انگریز کے چلے جانے کا نام آزادی نہیں تھا۔ اس کا ہندوستان کو چھوڑ دینا ہماری آزادی کے لئے راستہ ہموار کرنے کے مرادف تھا۔ انہوں نے کہا کہ آزادی سے ہمارا مفہوم کیا تھا، اس کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن علامہ اقبالؒ نے اسے دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے جب کہا کہ

کس دریں جا سائل و محکوم نیست —— عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یعنی جس خطۂ زمین میں قرآنی تصور کے مطابق آزادی کا جھنڈا لہرائے گا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ نہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا محکوم ہوگا، نہ کسی کا محتاج۔ جہاں تک محکومیت کا تعلق ہے، اس میں حکمرانی قوانینِ خداوندی کی ہوگی جو قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ اب رہا اس مملکت کی بنیادی خصوصیت کا دوسرا حصہ —— کہ اس میں کوئی شخص کسی کا محتاج نہیں ہوگا، تو یہی پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا جس پر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں قریب

دو گھنٹے تک ایسی مدلل، بصیرت افروز اور سحر انگیز تقریر فرمائی کہ پورا ہال جذب کیف کے عالم میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کے خطاب کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے مائدۂ ارض پر رزق بکھیر دیا ہے لیکن وہ ان معنوں میں قاسمِ رزق نہیں کہ ہر بھوکے کو خود آکر کھلائے اور ہر ننگے کو خود آکر پہنائے۔ رزق کی اس قسم کی تقسیم جس میں کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے، اس نظام کی رو سے ہوگی جو سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا۔ "رزق کی محمدی تقسیم" سے مراد اسی نظام کا معاشی پروگرام ہے جس میں رزق کے سرچشمے افراد کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ ہی کسی کے پاس دولت کے انبار جمع ہوتے ہیں۔ اس میں ہر فرد اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق پوری محنت اور دیانت سے کام کرتا ہے، اور نظامِ مملکت اس کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ پرویز صاحب نے واضح الفاظ میں بتایا کہ اس قسم کا نظام اپنی افراد کے ہاتھوں متشکل ہو سکتا ہے جن کے قلب نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو چکی ہو جسے قرآنِ کریم مومن کی خصوصیات سے تعبیر کرتا ہے۔ اس تبدیلی کی بنیاد۔ خدا، وحی، رسالت، قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ اُخروی کے محکم یقین پر استوار ہوتی ہے۔ یہ چیز نہ مغرب کے مادہ پرستانہ تصورِ زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے نہ اس پر متفرع کمیونزم یا سوشلزم سے۔ نہ ہی اس کے لئے کسی قسم کا تشدد برتا جاتا ہے نہ جبر و اکراہ۔ یہ پُرامن آئینی طریق سے عمل میں لایا جاتا ہے اور صحیح تعلیم و تربیت سے اس کی بنیادیں مضبوط کی جاتی ہیں۔ یہی طریق

(باقی صفحہ پر)

پرنس فین

گرمی کا بے نظیر ہے تحفہ پرنس فین
ہے آگیا سکون و کیف کی دنیا پرنس فین
ملتی ہے جس سے روح کو راحت بدن کو چین
لاتا ہے اس نسیم کا جھونکا پرنس فین
مضبوط پائیدار خوش انداز دیدہ زیب
ہے حسن اور جمال کا نقشہ پرنس فین
اس کی ہوا میں آتا ہے خس خانہ کا مزا
ہے اس لئے ہر ایک کو پیارا پرنس فین
گجرات کا پرنس ہی پنکھا ہے شاہکار
فنون کا ہے پرنس، دلارا پرنس فین

ہر دا اپنی تیزیٔ رفتار کے سبب
بس چاہتا ہے ایک اشارہ پرنس فین

پرنس انجنیئرنگ کمپنی رجسٹرڈ۔ رام تلائی روڈ گجرات

شاہد عادل

عورتوں کے اسلامی حقوق اور تعدد ازواج

قرآن کریم نے تعدد ازواج کی مشروط اجازت دی ہے (اور اس کی عائد کردہ شرائط کو ان صفحات میں کئی بار دہرایا جا چکا ہے) لیکن ہماری تاریخ کے مختلف ادوار میں اس مشروط اجازت سے جس طرح ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے وہ ایک دردناک کہانی ہے اور اس نے ہماری معاشرتی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں ہم صدیوں سے اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو خاندان بھی اس کی لپیٹ میں آیا وہ دوزخ کا نمونہ بن گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے قدامت پسند علماء تک نے ان مظالم کو محسوس کیا اور اسے ختم کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ "قانون کو ایسی حالت میں مرد کو صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے"!

(حقوق الزوجین۔ از ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۴۱ - ۴۲)

تعدد ازواج اور عائلی قوانین

خوش قسمتی سے حکومت پاکستان نے ان مظالم کو ختم کرنے کے لئے اس مسئلہ میں دلچسپی لی اور ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کے ذریعے تعدد ازواج کی مشروط اجازت کو قانون کا پابند کر دیا۔ معلوم نہیں کیا سیاسی وجوہات تھیں کہ جونہی حکومت نے یہ قدم اٹھایا تو وہی لوگ جو تعدد ازواج پر قانونی پابندیاں لگانے کی تجاویز پیش کر رہے تھے، اس کی مخالفت پر اتر آئے اور اس وقت سے لے کر اب تک برابر مخالفت کئے جا رہے ہیں۔ اب جبکہ الیکشن قریب آ رہے ہیں تو یہ مخالفت اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ پسماندہ علاقوں کے جہلاء اور عیش پسند امراء سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے یہ "چارٹ" بھی اچھی خاصی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مذہبی لیڈروں کی طرف سے ان طبقات کو وعدہ دیا جا رہا ہے کہ اقتدار سنبھالنے کے بعد ہم پہلا کارنامہ عائلی قوانین کی منسوخی کا سرانجام دیں گے اور اس کے بعد ہر شخص کو چار چار عورتوں سے شادی کرنے کی کھلی چھٹی ہو گی۔ اور

جب ان میں سے کسی سے جی بھر جائے اور اس کی جگہ ایک نئی نویلی لانے کا خیال انگڑائیاں لینے لگے تو اس کے لئے صرف منہ سے تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہہ دینا کافی ہوگا ـــ یہ مراد ہے عائلی قوانین کی منسوخی سے۔ اس کے ساتھ ہی بڑی چالاکی سے عورتوں کو یہ سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں کہ اسلام انہیں کہیں زیادہ حقوق عطا کرتا ہے۔ اسلئے عائلی قوانین کی منسوخی سے انہیں کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن "اسلام" عورتوں کو کون سے حقوق عطا کرتا ہے؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی جاتی ـــ دھوکا، ہر ایک کو دھوکا ـــ!

تعدد ازدواج سے متاثر ہونے والی خواتین کی حالت

لیڈروں کو اس قسم کے سیاسی وعدے کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن جہاں تک حقائق کا تعلق ہے اور تعدد ازدواج کے نتیجے میں کسی عورت یا اس کے والدین کو جن دردناک مصائب کا شکار ہونا پڑتا ہے' اسے صرف انہی کے دل جانتے ہیں جن پر یہ حالت نہ گزرے وہ ان جانکاہ مصائب کا اندازہ تک نہیں کرسکتے۔ (۳) معاملے کی سنگینی کا اندازہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ردِ عمل سے کیا جا سکتا ہے جب ایسا ہی معاملہ آپ کی بیٹی سے ہونے لگا۔ جب آپؐ سے حضرت فاطمہؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کے نکاح ثانی کے لئے اجازت طلب کی گئی تو آپؐ نے منبرِ نبوی پر رونق افروز ہو کر یہ اعلان فرمایا:

عن المسور بن مخرمۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول وھو علی المنبر ان بنی ھشام بن المغیرۃ استاذنوا فی ان ینکحوا ابنتھم علی ابن ابی طالب فلا اٰذن ثم لا اٰذن ثم لا اٰذن الا ان یرید ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی و ینکح ابنتھم فانما ھی بضعۃ منی یریبنی ما ارابھا و یؤذینی ما اٰذاھا۔

حضرت مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بنی ہشام بن المغیرہ نے مجھ سے اس بارے میں اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح علیؓ بن ابی طالب سے کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں ہرگز ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں اگر علیؓ چاہتے ہیں تو میری بیٹی کو طلاق دے دیں اور ان کی بیٹی سے نکاح کرلیں۔ میری بیٹی میرا جگر گوشہ ہے۔ جو چیز اسے تکلیف پہنچاتی ہے وہ مجھے بھی پہنچاتی ہے اور جو چیز اس کے لئے باعثِ ایذا ہے وہ میری ایذا کا بھی سبب ہے۔

(بحوالہ صحیح بخاری۔ باب ذب الرجل عن ابنتہ فی الغیرۃ والانصاف)

یہ حدیث بخاری شریف میں ایک سے زیادہ مرتبہ آئی ہے۔ اور جب عائلی قوانین کی مخالفت کرنیوالوں کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے مختلف حیثیتوں سے اسے گول مول کرنے کی کوشش کی۔ خیال رہے کہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ بخاری کے مشہور شارح علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب فتح الباری شرح صحیح بخاری کی جلد ۹ صفحہ ۱۸۷ پر اس حدیث پر مفصل بحث فرمائی ہے۔

تعدد ازدواج کی شرعی حیثیت

ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل اسلامی تعلیمات کے مطابق تھا اور یہی ہمارے ائمہ فقہ کا مسلک ہونا چاہیئے۔ لیکن عملاً ہمارے مولوی حضرات کی جانب سے عامۃ المسلمین کو عام طور پر یہی باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام میں چار عورتوں تک کی کھلی اجازت ہے۔ آیئے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ ان کے اس دعوے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

اس سلسلے میں یہ حضرات قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (النساء ۔ ۳)

اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ دو دو، تین تین، چار چار، لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک بیوی رکھو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں بے انصافی سے بچنے کے لئے یہ زیادہ قرین ثواب ہے۔

ہمارے مفسرین نے اس آیت پر لمبی چوڑی بحثیں کیں۔ اور ان سب میں ایک مشترکہ بات ہے جس کی طرف امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۰۰ میں اشارہ کیا ہے کہ ائمہ مجتہدین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ **تعدد ازواج فرض، واجب یا سنت نہیں ہے بلکہ یہ صرف مباح ہے** یعنی کوئی حاجتمند اگر اس کی ضرورت محسوس کرے تو اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی تمام شرائط پوری کرتا ہو۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم سے اس آیت کی جو تفسیریں منقول ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اجازت یتیموں کے مسئلہ سے مشروط ہے۔ علامہ الوسی صاحب روح المعانی نے بخاری، مسلم، نسائی اور بیہقی کی بہت سی احادیث نقل کی ہیں جن میں حضرت عائشہ رضؓ نے اس آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کی تفسیر کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اے بھانجے، وہ یتیم لڑکی ہے جو ولی کی نگرانی میں ہوتی تھی اور وہ اس کے مال میں شریک ہوتا تھا۔" (روح المعانی۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۹۸)

بعض ائمہ نے بھی اسی تفسیر کی تائید کی ہے۔ علامہ الوسی اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں۔

وقد قیل فی تفسیر الآیۃ الکریمۃ ان المراد من النساء الیتٰمی (ایضاً)

اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ النساء سے مراد یتیم عورتیں ہیں۔ (ایضاً۔ صـ۱۷۳)

واضح ہے کہ "یتیم عورتوں" سے مراد ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو شادی کے قابل تو ہوں لیکن ان کی شادی نہ ہو سکی ہو۔ مثلاً نا کتخدا بالغ لڑکیاں۔ بیوائیں وغیرہ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بعض ائمہ نے اسی آیت سے تعدد کی بجائے تحدید یعنی ایک بیوی تک محدود رہنا ثابت کیا ہے۔ اسے بھی علامہ الوسی ہی کی زبانی سنیئے۔

وجوز بعضھم کون الاشارۃ الی ثلاثۃ امور۔ التقلیل من الازواج واختیار الواحدۃ والتسری۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۵)

بعض ائمہ نے اس آیت کی روشنی میں تین امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی تحدید ازواج، اور صرف ایک بیوی تک محدود رہنا۔ یا لونڈی سے نکاح کرنا۔

امام شافعی کی تفسیر

یعنی وہ تفسیر جو اکثر ائمہ ومفسرین سے منقول ہے۔ شافعی مذہب کے بانی امام شافعی رحؒ نے اس آیت کی تفسیر اور ہی رنگ میں کی ہے۔ ان کے نزدیک شادی کے سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ تعدد ازواج تو کجا ایک عورت سے شادی کے بجائے بلکہ میں بھی نفلی عبادات میں مشغول رہنے کو زیادہ افضل قرار دیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ۳ صـ۲۰۳) پھر اس آیت کے آخری ٹکڑے الّا تعدلوا کا مفہوم یہ بیان فرماتے ہیں" تاکہ تمہارے اہل وعیال زیادہ نہ ہو جائیں۔" (روح المعانی۔ جلد ۴۔ صـ۱۷۷)

علامہ الوسی امام شافعی رحؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ثمّ المراد بالعیال علیٰ ھذا التفسیر یحتمل ان یکون الازواج کما اشرنا الیہ وعدم کثرۃ الازواج فی اختیار الواحدۃ۔ (ایضاً)

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس آیت میں عیال سے مراد ازواج ہیں۔ اور زیادہ کی بجائے صرف ایک بیوی تک محدود رہنا۔

امام شافعی رہ کی تفسیر پر اعتراضات

امام شافعی رہ کی اس تفسیر پر اعتراض بھی کئے گئے ہیں اور عائلی قوانین کی مخالفت کرنے والوں کی دیانتداری ملاحظہ ہو کہ وہ ان اعتراضات کو تو بڑی آب و تاب سے نقل کرتے ہیں۔ لیکن مفسرین نے ان اعتراضات کے جو مفصل جواب دیئے ہیں، ان پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ بڑے بڑے مفسرین نے جن میں امام فخرالدین رازی اور علامہ آلوسی صاحب روح المعانی شامل ہیں، ان اعتراضات کا جواب دے کر امام شافعی رہ کی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔ ان مفسرین نے ان اعتراضات کے جو جواب دیئے ہیں ان کا خلاصہ یوں ہے۔

(۱) امام الکسائی نے فصیح عربوں سے "عال" کے یہی معنی نقل کئے ہیں کہ جب عیال زیادہ ہو جائیں۔ الاصمعی اور الازہری جیسے ائمہ ادب و لغت نے بھی اس لفظ کے یہی معنی کئے ہیں جو اس کے مستند ہونے کے لئے کافی ہے۔ (تفسیر روح المعانی جلد ۴ ص ۱۹۶)

(۲) بعض سلف صالحین سے بھی اس لفظ کی ایسی ہی تفسیر منقول ہے۔ ابن ابی حاتم نے جو ایک مشہور عالم تابعی ہیں، یہی معنی روایت کئے ہیں۔ اور حضرت طاؤس کی قرأت ان لا تعیلوا اس کی تائید مزید کرتی ہے۔ (ایضاً)

(۳) امام القرأ علامہ الدوری نے اسے "عیلہ کثیر" کی لغت قرار دیا ہے اور اس کی تائید میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

وان الموت تاخذ کل حیٍ　　بلاشک وان امشی وعالا

ای وان کثرت ماشیتہ۔　　(ایضاً)

بے شک موت ہر زندہ کو جا لیتی ہے۔ چاہے اس کے مویشی اور عیال کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں امام شافعی رہ کی تفسیر کو ترجیح دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اگر "تعولوا" کے معنی ظلم کے لئے جائیں تو پھر اس آیت میں تکرار لازم آتا ہے کیونکہ ظلم کا مفہوم تو انصاف نہ کر سکنے کے خدشے سے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ امام شافعی رہ کی تفسیر اختیار کرنے سے ایسا کوئی تکرار لازم نہیں آتا۔ اس لئے یہی اس آیت کی عمدہ تفسیر ہے۔

چار نہیں بلکہ نو بیویاں

بعض دوسرے ائمہ مجتہدین جن میں ظاہری مذہب، امام ابن الصباغ، امام عمرانی اور بعض شیعہ ائمہ شامل ہیں، اس آیت کی اور ہی

الذکی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ یہ بحث ذرا بہت لمبی ہے اسلئے صرف اس کے ترجمے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"اس آیت میں مثنیٰ وثلاث و رباع میں جو 'واؤ' ہے وہ جمع کے لئے ہے (یہ ظاہریہ کا استدلال ہے ان کے نزدیک نو بیویوں کی اجازت ہے)۔ لغت میں لفظ مثنیٰ کے معنیٰ "دو دو" کے ہیں، نہ کہ صرف "دو"۔ اور اگر کہا جائے کہ دو دو آدمی آئے تو یہ الفاظ ایک ہزار کی تعداد میں آنے والے اشخاص کے لئے بھی بولے جا سکتے ہیں کہ انکی تعداد دو دو کر کے آئی مثلاً کہا جاتا ہے کہ "جاء القوم مثنیٰ۔ (لوگ دو دو کر کے آئے۔ اسی طرح ثلٰثہ اور رباع کے معنی ہوں گے۔ یہ تو عربی لغت کا مسئلہ ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ پس آیت مذکورہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ "دو دو" یا "تین تین" یا "چار چار" عورتوں سے شادی کرے۔ اس میں یہ کوئی پابندی نہیں کہ اس کے بعد "دو دو" یا "تین تین" یا "چار چار" کی دوسری جماعت نہ ہو۔ کیونکہ لغت کے قواعد اور عرف کے لحاظ سے یہ شرط ٹھیک نہیں۔ مثلاً اگر کسی آدمی کے پاس ایک ہزار آدمی جمع ہوں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ دو دو یا تین تین کر کے آئے۔ اس تفسیر کی رو سے لاتعداد شادیاں جائز ہیں۔ اب واؤ چاہے جمع کے لئے یا اختیار کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار۔ جلد ششم۔ صـ ۱۵۰)

متضاد تفسیریں اور ائمہ کا فیصلہ

یہ ہیں تعدد ازدواج کی حمایت میں پیش کی جانے والی آیت کی مختلف تفسیریں۔ ان مختلف اور متضاد تفاسیر کو دیکھ کر خود مفسرین عجیب شش و پنج میں پڑ گئے کہ کس تفسیر کو ترجیح دیں اور کسے رد کریں۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اس آیت سے چار بیویوں والا مسئلہ حتمی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا جواز احادیث سے ملتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب اپنی مشہور تفسیر فتح البیان کی جلد ۲ کے صفحہ ۱۶۸ پر فرماتے ہیں۔

فالاولی ان یستدل علی تحریم الزیادۃ علی الاربع بالسنۃ لا بالقرآن۔ پس زیادہ صحیح یہ ہے کہ چار سے زیادہ بیویوں کی حرمت کا استدلال حدیث سے کیا جائے نہ کہ قرآن مجید سے۔

تعدد ازدواج اور احادیث

جب خود مفسرین کی تصریح کے مطابق قرآن مجید سے چار بیویوں والا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا تو ہم ان احادیث کو سامنے لاتے ہیں

جنہیں مفسرین اور محدثین نے پیش کیا ہے۔ یہ ایک ہی حدیث ہے جو مختلف طریقوں سے مروی ہے جن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں جن الفاظ کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے اس کا ترجمہ یوں ہے۔

"قیس بن حارث کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ لیکن اسلام لانے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے صرف چار بیویاں اختیار کر لینے کا حق دیا تھا۔"

(نیل الاوطار۔ جلد ۶ ۔ صفحہ ۱۵۰)

یہ ہے وہ حدیث جس سے چار عدد بیویوں کا جواز ثابت کیا جاتا ہے۔ اتنی اہم حدیث کو ائمہ حدیث نے جو مختلف زاویوں سے پرکھا تو اس کی صحت مشکوک نکلی اور یہ ضعیف ثابت ہوئی۔ علامہ شوکانی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حدیث قیس بن الحارث و فی روایۃ الحارث بن قیس فی اسنادہ محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ و قد ضعفہ غیر واحد من الائمۃ۔

(نیل الاوطار۔ جلد ۶ ۔ صفحہ ۱۵۰)

قیس بن حارث دوسری روایت کے مطابق حارث بن قیس کی حدیث کے ایک راوی محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہیں جسے اکثر ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

علامہ شوکانی مزید فرماتے ہیں کہ حارث بن قیس نام کے شخص کی کوئی دوسری روایت نہیں۔ صرف مذکورہ بالا حدیث میں اس کا ذکر ہے۔

علامہ شوکانی کی ان تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث سے بھی چار ازواج کا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ ہمارے مفسرین اور محدثین نے قرآن و سنت سے چار بیویوں کی حد ثابت کرنے میں کس طرح اپنے عجز کا ثبوت دیا ہے لیکن اس کے باوجود چار بیویوں کا مسئلہ اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا یہ قرآن مجید کا حکم ہے کہ جس کے بدلنے سے کفر لازم آئیگا۔

قرآن، حدیث اور فقہ

یہ تھی قرآن و حدیث کی رُو سے مسئلہ تعدد ازواج کی شرعی حیثیت لیکن یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں قرآن و حدیث تو صرف زیب داستان کے لئے رہ گئے ہیں۔ عمل صرف اسی مسئلہ پر ہوگا جس کی سند فقہ سے مل جائے۔ طلاق بدعت یعنی بیک مجلس تین طلاقیں دینے کو تمام حضرات قرآن و سنت کے خلاف بتاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب اس پر پابندی عائد کی گئی تو خود انہی حضرات نے جو اسے قرآن و سنت کے خلاف بتاتے تھے یہ کہہ کر اس اقدام کی مخالفت کرنے لگے کہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہے۔ تو ان کے اس طرز عمل

سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مسائل میں اصل دارومدار فقہ اور خاص کر فقہ حنفی ہے تو آیئے ہم آپ کو ائمہ فقہ کے پاس لے چلتے ہیں۔ امام شافعیؒ کا مسلک تو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ہم امام ابوحنیفہؒ کا فیصلہ سننے لاتے ہیں۔

تعدد ازواج اور امام ابوحنیفہؒ

فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بڑا انقلابی تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ملوکیت نے ان کی ایک نہیں چلنے دی اور انکی کوئی کتاب ہم تک نہ پہنچنے دی۔ حنفی فقہ کی جتنی کتابیں متداول ہیں وہ سب بعد میں لکھی گئی ہیں۔ اور امام صاحبؒ کے اقوال ان میں کہیں کہیں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ تعدد ازواج کے مسئلہ پر جو ملوکیت کا خاصہ ہے، امام صاحبؒ نے بڑی سیر حاصل بحث فرمائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ ہم تک پوری کی پوری نہیں پہنچ سکی۔ لیکن جو کچھ پہنچی ہے ہمارے مدعا کے لئے کافی ہے۔ علامہ مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اسے مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ہم انہیں کی زبانی اسے نقل کرتے ہیں۔

"تعدد ازواج کے بارے میں امام صاحبؒ کا جو نقطۂ نظر تھا دوسری جگہ لوگوں نے اسے بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم غالباً (النخعی) کے متعلق امام صاحبؒ سے کسی نے اس واقعہ کا ذکر کیا کہ کسی نے ہدیۃً کوئی لڑکا ان کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کیا۔ اس نے کہا "خرید لیجئے"۔ بولے کہ میاں چار سو درہم میرے پاس اگر ہوتے تو دوسری بیوی نہ کرتا۔

اس نے کہا کہ ایک بیوی کیا آپ کے لئے کافی نہیں۔ بولے۔ اِنَّ حَاضَتْ حِضْتُ۔ (جب اس کے ایام کا زمانہ آتا ہے تو میں بھی گویا ایام میں بیٹھ جاتا ہوں) امام صاحبؒ سے اس قصے کو سن کر کہا کہ بھائی مجھے تو رسول اللہ کے صحابی حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک بیوی والا ضرور میں رہتا ہے اور **دو بیویوں والا شرور کا شکار رہتا ہے**۔ یعنی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ روایت سنا کر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے ساتھ جسے اتفاق نہ ہو وہ تجربہ کر کے دیکھ لے یا شاید جابرؓ ہی کا قول نقل کیا۔ اور کہا کہ ابراہیم کو شاید تجربے کا موقعہ نہ ملا۔

اور اس کے بعد کہنے لگے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ عدل و انصاف کا اپنی بیویوں کے ساتھ تھا جو اس برتاؤ کو نہ کر سکے تو وہ ظالموں میں لکھا جائے گا۔ پھر وہ حدیث سنائی جس میں آیا ہے کہ دو بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنیوالا قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ ایک شق اس کے بدن کا ساقط ہوگا۔

امام صاحبؒ نے اس پر اور اضافہ کیا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت اپنے لئے تو میں نے اس مسلک

کو اختیار کیا ہے اور فرمایا۔ بھائی بے فکری اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں۔ پھر عورتوں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے ان الفاظ کو دہرایا کہ یہ عورتیں تمہارے ہاتھوں میں بندھی ہوتی ہیں۔ بس ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہنا۔ راوی کا بیان ہے کہ دیر تک امام صاحب اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے لیکن مجھے بس اس قدر یاد رہ گیا۔ کاش امام صاحب کی پوری تقریر راوی کو یاد رہ جاتی، تو تعدد ازواج کے مسئلہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے امام کا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے آجاتا اور پہلی صدی تک مسلمانوں کے خیالات کی وہ ایک تاریخی شہادت ہوتی۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں یورپ کی نکتہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے بنانی شروع کی ہیں، ان کا بہترین جواب امام صاحب کا یہ بیان ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو جو کچھ راوی کو یاد رہ گیا ہے وہ بھی اس مدعا کے لئے کافی ہے۔"

(حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی مطبوعہ کراچی۔ صفحہ ۲۱۳۔ پہلا ایڈیشن)

امام احمد بن حنبل کا مسلک

امام ابو حنیفہ رح اور امام شافعی رح کے بعد تیسرے امام احمد بن حنبل رح کا مسلک ملاحظہ ہو۔ حنبلی فقہ کی کتابوں میں آپ کا مسلک ان الفاظ میں دیا جاتا ہے۔

قالوا يندب نكاح امراة واحدة فلا يعدد الازواج فان فى التعدد خطرة عدم العدل فيقعُ فى المحرم۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴۔ صفحہ ۱۰)

صرف ایک عورت سے شادی کرنا مستحب ہے۔ پس بیویاں زیادہ نہ ہوں کیونکہ ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں عدل سے ہٹ جانے کا خطرہ ہے جس سے حرام فعل کا ارتکاب ہوتا ہے۔

حنابلہ نے یہاں ندب (مستحب) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حنفیوں کے ہاں مستحب اور سنت دو الگ چیزیں ہیں۔ لیکن حنابلہ کے نزدیک یہ دونوں اصطلاحات مترادفہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں امام احمد بن حنبل رح کے نزدیک سنت کی رو سے بھی شادی کا طریقہ ایک بیوی تک محدود رہتا ہے۔

نگاہ بازگشت

ان تفصیلات کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے۔

(۱) شریعت اسلامی میں تعدد ازدواج کی مشروط اجازت ہے۔

(۲) تعددِ ازدواج کی اس مشروط اجازت سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

(۳) دوسری بیوی کے آنے سے پہلی بیوی اور اس کے خاندان والوں کا مصائب کا شکار ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

(۴) حضرت علیؓ نے دوسری شادی کے لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت چاہی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری شادی کے لئے بیوی یا اس کے خاندان والوں کی اجازت ضروری ہے۔

(۵) بیوی یا اس کے خاندان والے اس کی اجازت دینے سے انکار بھی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

(۶) جس آیت سے تعددِ ازواج کی اجازت ثابت کی جاتی ہے، مفسرین نے اس کی اتنی متضاد تفسیروں کے بعد فیصلہ یہ دیا ہے کہ اس کا ثبوت قرآن سے نہیں بلکہ حدیث سے ملتا ہے۔

(۷) جو حدیث اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے محدثین کے نزدیک وہ ضعیف ہے۔

(۸) امام شافعی قرآن مجید سے تحدیدِ ازواج ثابت کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ احادیث کی روشنی میں ایک بیوی پر قناعت کا مسلک پیش کرتے ہیں۔ جبکہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ایک بیوی پر قناعت کرنا سنت ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں قارئین خود فیصلہ کریں کہ عائلی قوانین میں تعددِ ازواج کی مشروط آزادی کو جو قانونی شکل دی گئی ہے وہ کیسے خلافِ اسلام ہو سکتی ہے؟

(۰)

طلوعِ اسلام۔ جیسا کہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے متعدد بار لکھا جا چکا ہے قرآن مجید میں ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی اجازت ایک ہی آیت (۴/۳) میں دی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ازدواجی سلسلہ میں قانون تو وحدتِ زوج (ایک میاں ایک بیوی) کا ہے لیکن اگر معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ یتیم بچوں، بالغ نا کتخدا لڑکیوں یا بیواؤں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے، اور ان کے متعلق کا کوئی اطمینان بخش حل نہ مل سکتا ہو تو اسلامی حکومت اس کی اجازت دے سکتی ہے کہ ان عورتوں کو بیویوں کی حیثیت سے گھروں میں بسا لیا جائے۔ بشرطیکہ ایسا کرنے سے کسی پر ظلم کا اندیشہ نہ ہو ـــ بس یہ ہے قرآن مجید کی ایک آیت جس میں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ـــ یا یوں کہئے کہ

جس میں، ہنگامی حالت میں، قانونِ وحدتِ زوج میں استثنار کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک جو روایت یا فقہ کا فیصلہ اس آیت کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ دین میں آخری حجت قرآنِ کریم ہے۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ بات سامنے آگئی۔ مودودی صاحب نے (اس سے پہلے بھی بتایا تھا۔ اور اب اسے پھر دہرایا ہے کہ) جب وہ لندن ہسپتال میں زیرِ علاج تھے تو ایک نرس ان کے پاس بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتی تھی۔ ایک دن اُس نے اسلام میں تعددِ ازواج پر اعتراض کیا۔ تو مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے معاشرہ میں وحدتِ زوج کے بعد، لوگ اس کثرت سے حرامکاری کرتے ہیں، تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ ان عورتوں سے زنا کرنے کے بجائے انہیں بیویاں بنا لیا جائے۔ تعددِ ازواج کی اس فلسفیانہ حکمت سے وہ نرس مطمئن ہو گئی۔

بالفاظِ دیگر، مودودی صاحب نے اس نرس سے کہا کہ مرد ایک عورت پر اکتفا ہی نہیں کر سکتا۔ اگر اسے ایک سے زیادہ بیویاں نہ دی جائیں تو وہ زنا کریگا ـــــ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب نے مصلحتاً بات ادھوری چھوڑ دی۔ نرس نے یہ ضرور پوچھا ہوگا کہ حضرت! آپ کی کتنی بیویاں ہیں۔ اور جب انہوں نے کہا ہوگا کہ ایک ـــــ تو اس نے پوچھا ہوگا کہ اس کے بعد آپ کیا کرتے ہیں؟ معلوم نہیں اس کا مودودی صاحب نے کیا جواب دیا ہوگا!

اور شاید اس نے یہ بھی پوچھا ہو کہ حضرت! اگر ایک بیوی ایک خاوند پر اکتفا نہ کر سکتی ہو تو وہ کیا کرے؟

آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرات کس طرح دنیا میں اسلام کو اضحوکہ بناتے رہتے ہیں اور پھر اپنی ان حماقتوں کا کس فخر سے اعلان کرتے ہیں ـــــ اور ان کے مریدوں کا حلقہ، ان کی فکرِ بلند کے کس طرح قصیدے پڑھتا رہتا ہے!

قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس قسم کی جنسی بدنہادی (SEX - PERVERSION) کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جب کہا کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳) جن لوگوں کے لئے شادی کا انتظام نہ ہو سکے، وہ ضبطِ نفس سے کام لیں؛ قرآن جنسی جذبات پر ضبطِ نفس سے کنٹرول کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کی بے محابا تسکین کے لئے عورتوں کی کھیپ حرم میں داخل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

جنسی پابندیوں کا اثر قوموں کی زندگی پر

SEX AND CULTURE

پرویز

[۱۹ر جولائی (اتوار) کی صبح، پرویز صاحب کے ہفتہ واری درس قرآن مجید میں، سورۃ النسآء کی آیت ۱۵ زیرِ درس تھی جس میں، فحاشی اور بے حیائی کو روکنے کی تاکید کی گئی ہے۔۔۔ ضمناً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس آیت کا تعلق جرم زنا سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ جرم زنا کے اثبات کے لئے چار عینی شاہدوں کی شرط عائد کرنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نہ یہ جرم ثابت ہو، نہ کسی کو سزا دی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا قانون وضع اور نافذ کرنا ۔۔۔ معاذ اللہ ۔۔۔ خدا کے ہاں ۔۔۔ نیز اس آیت میں سزا صرف یہ تجویز کی گئی ہے کہ متعلقہ عورت کو پابند مسکن کر دیا جائے حالانکہ سورۃ النّور (۲۴/۲) میں جرم زنا کی سزا، بالفاظِ صریح سو کوڑے متعین کی گئی ہے۔ سورۃ النسآء کی آیت ۱۵ کا تعلق ان بے حیائی کی باتوں سے ہے جن کی اگر روک تھام نہ کی جائے تو وہ رفتہ رفتہ زنا تک لے جانے کا موجب بن سکتی ہیں۔ انہیں آپ مبادیاتِ زنا کہہ سکتے ہیں ۔۔۔!

پرویز صاحب نے اپنے درس میں بتایا کہ قرآن مجید نے حفاظتِ عصمت کو دین کی مستقل (غیر متبدل) اقدار میں شمار کیا ہے اور اس کی بڑی سخت تاکید کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عصمت کے مستقل اور غیر متبدل قدر قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کو (یورپ کی طرح) سوسائٹی کی صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا کہ وہ جنسی اختلاط کی جس شکل کو مناسب سمجھیں جائز اور قانوناً صحیح قرار دے دیں۔ اور جب جی چاہے اس میں تبدیلیاں کرتے جائیں۔ جنسی اختلاط پر جو پابندیاں قرآن نے عاید کی ہیں وہ مستقل اور ابدی ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی

نہیں کی جا سکتی۔ ان پابندیوں کی نگہداشت (یعنی ان کی خلاف ورزی نہ) کرنے کا نام عصمت ہے۔ پرویز صاحب نے کہا کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے عصمت کا تقاضا (بالعموم) لڑکیوں (عورتوں) سے کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ لفظ بھی طبقہ نسواں سے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ لڑکوں (مردوں) کے باعصمت ہونے پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم مرد اور عورت دونوں سے حفاظتِ عصمت کا یکساں تقاضا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے جرم زنا کی سزا، عورت اور مرد دونوں کے لئے ایک ہی متعین کی ہے۔ جب وہ حفاظتِ عصمت کو مومنین کی بنیادی خصوصیات بتاتا ہے تو اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم نے، تحفظِ عصمت کے سلسلہ میں دو برگزیدہ ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک حضرت مریم علیہا السلام اور دوسرے حضرت یوسف علیہ السلام۔ ان کے تذکار جلیلہ سے جہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، اگر انسان کا قوانینِ خداوندی پر ایمان محکم اور عزم راسخ ہو تو وہ اپنی عصمت کی حفاظت کر سکتا ہے[1]۔ وہاں یہ صراحت بھی مطلوب ہے کہ جس طرح عورت بھی وہی باوقار اور واجب الاحترام ہو سکتی ہے جو اپنی عصمت کی حفاظت کرے، اسی طرح مرد بھی وہی سرفرازیوں اور سربلندیوں کے مقامِ رفیع پر فائز ہو سکتا ہے جو اپنے پاؤں میں لغزش نہ آنے دے۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے نہایت وضاحت سے بتایا کہ تحفظِ عصمت سے مقصود صرف اتنا ہی نہیں کہ اس سے سوسائٹی کا نظم وضبط قائم رہتا ہے اور اولاد کی ولدیت کا صحیح تعین ہو جاتا ہے۔ اس کا بڑا گہرا تعلق قوموں کے عروج وزوال سے ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے "سلیم کے نام ایک خط" میں سے کچھ اقتباسات پیش کئے جن میں ایک بلند پایہ مغربی محقق کی تحقیقات کے نتائج سامنے لائے گئے تھے۔ یہ اقتباسات اس قدر پرجستہ، دلنشیں اور اثر انگیز تھے کہ درس کے بعد اکثر سامعین نے تقاضا کیا کہ "سلیم کے نام (اس خط)" کو بہ تمام وکمال طلوع اسلام میں شائع کیا جائے کیونکہ آجکل مغرب کی نقالی میں خود ہمارے معاشرہ میں بے حجابی کا جو سیلاب اس بے باکی سے امڈ رہا ہے، اس کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ اس قسم کے لٹریچر کی اشاعت عام کی جائے۔ "سلیم کے نام یہ خط" اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا اور اب "سلیم کے نام خطوط" کے مجموعہ (جلد سوم) میں شامل ہے۔ اسے ہم احباب کے تقاضا اور وقت کی ضرورت کے احساس سے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

---

[1] "زنا بالجبر" کا سوال ہی الگ ہے۔ اس میں اسی قسم کا طبیعی جبر کارفرما ہوتا ہے جس قسم کا جبر، قتل کی صورت میں عمل میں لایا جاتا ہے۔

سلیم میاں! تم نے بالآخر اس موضوع پر بھی بات چھیڑ دی جس سے تم اس وقت تک اتنی جھجک محسوس کر رہے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ (تمہارے الفاظ میں) میرے احترام کے جذبہ پر اس موضوع کی اہمیت غالب آ گئی۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بات کرتے وقت اس روایتی حجاب کو آڑے نہیں آنے دیا جو اس باب میں اکثر نوجوانوں کے گلوگیر ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ایسے اہم عنوان پر صحیح راہ نمائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور یہی حجاب ان کی تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جنسی تعلقات کے موضوع کو اس قدر شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے کہ "شرفیوں کی مجلس" میں اس کا نام تک لینا بھی بے حیائی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ غیر شعوری طور پر نتیجہ ہے اس خانقاہی ضابطۂ اخلاق (MYSTICAL ETHICS) کا جو عیسائیت کی رہبانیت سے، تصوف کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے ہاں آ پہنچا اور جس نے ہمارے تمام تصورات کو متاثر کر دیا۔ چونکہ رہبانیت میں جنسی تعلقات کو سخت معیوب اور وجہِ ذلتِ انسانیت سمجھا جاتا ہے اس لئے ہمارے ہاں بھی جنسیات کو نہایت شرمناک تصور کیا جاتا ہے اور کسی کے سامنے اس کا ذکر آ جانے سے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب ہمارے معاشرے میں جنسیات کے ذکر تک کو اس قدر شرمناک سمجھا جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ اس موضوع پر ہمارے ہاں لٹریچر کس طرح مل سکتا ہے! چنانچہ جہاں تک میری معلومات یا دری کرتی ہیں، ہمارے ہاں اس موضوع پر ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے سنجیدگی سے کسی نوجوان کے ہاتھ میں دیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) چوری چھپے اس سطحی (CHEAP) جنسی لٹریچر کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں جو آوارگانِ مغرب کی بدلگام ذہنیت کا پیدا کردہ ہوتا ہے، اور جس سے طرح طرح کے ذہنی، اعصابی اور جسمانی مفسدات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (حالانکہ یورپ میں اس موضوع پر سائنٹیفک سنجیدہ اور بلند پایہ لٹریچر کی بھی کمی نہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے نوجوان اس موضوع پر بات کرنے سے شرماتے ہیں، اسلئے ان کی صحیح راہ نمائی ہو نہیں سکتی اور ان کی رسائی صرف سطحی لٹریچر تک ہوتی ہے)۔ بہرحال تم نے اچھا کیا کہ اس موضوع کے متعلق بے تکلفی سے بات چھیڑ دی۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ نہایت نازک، لیکن بڑا اہم مسئلہ، اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ لو سنو۔

جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، حیوانی سطح سے انسانی پیکر میں پہنچی تو وہ حیوانی زندگی کے اکثر خصائص و لزومات بھی اپنے ساتھ لائی۔ کھانا۔ پینا۔ سونا وغیرہ (جسم کا طبعی نظام) حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ بالفاظِ دیگر، یہ انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاہر ہیں۔ انہی میں افزائشِ نسل (PROCREATION) اور اس کے لئے جنسی جذبہ (SEXUAL INSTINCT) بھی شامل ہے۔

کھانے پینے کے معاملہ میں حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے از خود عاید ہوتی ہیں۔ مثلاً

بکری گھاس کھاتی ہے، گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے، گھاس نہیں کھاتا۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف گھیر کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ حیوانات پر یہ پابندیاں از خود عاید ہوتی ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس انسانی بچے کو دیکھئے۔ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح شاخ نبات (مصری کی ڈلی) کو۔ وہ کبھی دھکتا ہوا کوئلہ بھی پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگانا دکھائی دیتا ہے۔ اس پر فطرت کی طرف سے از خود ایسی پابندیاں عاید نہیں ہوتیں جیسی حیوانات پر عاید ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اسلئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرے کی طرف سے عاید کی جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ (مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے اسلئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہے ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عاید کردہ نہ ہوں بلکہ

معاشرتی پابندیاں

خدا کی طرف سے عاید کردہ ہوں) معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور وحی کی رُو سے متعین کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بنا پر بدلی بھی جا سکتی ہیں۔ لیکن وحی کی رُو سے عاید کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہیئے۔ اس فیصلہ کی رُو سے (KEEP TO THE LEFT) سڑک کا قانون قرار پا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر "دائیں طرف چلو" کا قانون بھی نافذ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحی خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً) لحم خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس قانون میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ وحی خداوندی کے ماننے والوں کو لحم خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے نہیں کرتی۔ لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار و ارادہ سے کرنا ہوگا۔

جنسی جذبہ پر پابندیاں

کھانے پینے کے علاوہ جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عاید ہوتا ہے۔ ایک بیل ہر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا، تاوقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرار حمل کا طبعی تقاضا اس کی دعوت نہ دے۔ لیکن انسان پر اس قسم کا کوئی کنٹرول نہیں عاید کیا گیا وہ جب جی چاہے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کر سکتا ہے۔

حیوانات پر اس طبیعی کنٹرول کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عاید نہیں کیا گیا۔ (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عاید کی گئی ہیں۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عاید کی جاتی ہیں اور وحی کی رُو سے بھی۔ معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام اور ممالک میں مختلف نوعیتوں کی ہیں۔ نیز کسی ایک ہی قوم میں مختلف زمانوں میں ان پابندیوں میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط کی صورت پیدا کر لیں تو معاشرہ کی نگاہوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ نہ ہی ایسا کرنا قانوناً جرم ہے۔ اسی طرح اگر ایک شادی شدہ مرد یا عورت کسی اور سے جنسی تعلق پیدا کرے تو یہ کوئی معاشرتی جرم نہیں۔ یہ اسی صورت میں جرم قرار پائیگا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ ان پابندیوں میں ردّ و بدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اس وقت تک وہاں یہ صورت ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں وہاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے، ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرہ کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ (اس وقت ان فیصلوں پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اگر معاشرہ چاہے تو اپنی عاید کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے[1])

وحی کی پابندیاں

اس کے برعکس، اس باب میں وحی (یعنی قرآنِ کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عاید کی ہیں۔ ان پابندیوں کا ماحصل یہ ہے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد یا عورت) کو جنسی اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں اور شادی کے بعد نہ بیوی کسی غیر مرد سے اختلاط پیدا کر سکتی ہے نہ میاں کسی اور عورت سے۔ اس قسم کا اختلاط فرد کا نہیں بلکہ معاشرہ کا جرم ہے۔ اور اس جرم (زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کی جنسی بے باکیوں سے متأثر ہو کر، ہمارے ہاں کے نوجوان طبقہ میں بھی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبیعی تقاضے کی تسکین یا انسدادِ نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل

---

[1] انگلستان میں اب لواطت کو بھی قانوناً جائز تسلیم کر لیا گیا ہے اور امریکہ میں لڑکوں کی ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں ہو رہی ہیں اور پادری ان شادیوں کی توثیق کرتا اور برکات کی دعائیں دیتا ہے۔ (۱۹۷۰ء)

(BIOLOGICAL ACTION) ہے اور بس۔ اس معاملہ کو لڑکی اور لڑکے کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاہیئے اور نکاح وغیرہ کی پابندی، محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہونی چاہیئے، نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی (مغرب کی طرح) جنسی فوضویت (SEXUAL ANARCHY) کی فضا عام ہوتی جارہی ہے اور وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں [یعنی عفت وعصمت (CHASTITY) کے مطالبہ] کو غیر فطری جکڑ بندیاں قرار دیا جا رہا ہے۔

ان پابندیوں کی مصلحت

سوال یہ ہے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے ہیں؟ یا ان کا تعلق عالمِ انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ہے۔ اگر ان کا مقصد محض معاشرتی نظم وضبط ہے، تو بے شک معاشرہ کو اس کا حق ہونا چاہیئے، کہ وہ (اپنے مصالح کے پیشِ نظر) ان میں ردّوبدل کرے۔ لیکن اگر ان کا تعلق انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروپ کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ان پابندیوں میں تبدیلی کرکے انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔ قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب اس نے کہا کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ..... هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۔ (۲۳/۱-۵) تو اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ عفت وعصمت کا ان کی فلاح وبہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں فائز المرام (PROSPEROUS) نہیں ہوسکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں۔ لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں، سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعویٰ کو بطور ایمان (FAITH) ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسکے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں[1]۔ ان لوگوں

قرآنی دعویٰ کی دلیل

(بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد و بے دین کہہ کر تیوریاں چڑھا لیں۔ قرآن اپنے ہر دعویٰ کی بنیاد علم وبصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل وبرہان کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جوں جوں

---

[1] انہیں اس کا علم نہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے ایمان (FAITH) کا نام نہیں بلکہ اس (CONVICTION) کا نام ہے جو علم وبصیرت کی رُو سے حاصل اور دلائل وبراہین کی رُو سے محکم ہو۔

انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ...... (۴۱/۵۳) ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تا آنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہو چکی ہیں وہ قرآن کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ۔ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی سنجیدہ توجہ اور گہری فکر سے غور و خوض کیا جائے۔

غور و فکر

جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوتی اسلئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے، زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوتی ہو! حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو اور تقلید کہن زندگی کی محمود روش قرار پا چکی ہو، ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ یورپ میں (دیگر شعبوں کی طرح) جنسیات نے

علمائے مغرب کی تحقیقات

بھی ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں پر تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات (SOCIOLOGISTS) تہذیب کے مؤرخ۔ علمائے جنسیات اور ماہرین علم تجزیۂ نفس (PSYCHO - ANALYSTS) وغیرہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں (PRIMITIVE TRIBES) کے احوال و کوائف، بود و ماند، رسوم و معاشرت اور اجتماعی اعمال و معتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ (DATA) سے نتائج مستنبط کرتے ہیں۔[1] اس مقصد کے لئے انہیں جن صبر آزما منازل اور مشقت طلب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی

---

[1] واضح ہے کہ ان کا انداز اس طریق سے مختلف ہے جو آجکل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جس کی رو سے ایک خاص خطہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوالنامہ دے دیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد و شمار (STATISTICS) اکٹھے کر کے نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں اور ان نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر اور فطرتِ انسانی کے ترجمان ہیں۔ آجکل امریکہ میں (KINSLEY) سے بلند تر کے "محقق" اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریق کار کبھی عالمگیر (UNIVERSAL)

ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گزار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو وہ پہنتے تھے۔ انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہیں میں شادیاں بھی کیں۔ اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے متعلق براہ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ہیں، ان میں جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدن (CULTURE) کا اس سوال سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔ انہی محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J.D.UNWIN) کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر انون نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے اسّی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سول مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب (SEX AND CULTURE) میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

> دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

اصل کتاب سے بھی پہلے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عاید کر رکھی ہوں۔ (XIV)

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

> کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر

ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (صفحہ ۳۲)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے! وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (صفحہ ۳۰۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (۳۳۰)

اس لئے اگر کسی قوم میں متمدنی تبدیلی واقع ہو یعنی اُسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہونگی اسی قسم کے نتائج مرتب ہونگے۔

جبری تجرّد

سب سے پہلے تجرّد کی زندگی (CELIBACY) کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

> جبری تشدد (COMPULSORY CELIBACY) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۳۸۲)

جبری تجرّد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقاید یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرّد کی زندگی وجہِ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرّد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرّد کی زندگی ہی شرفِ انسانیت کی زندگی ہے تو دوسری طرف آجکل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عاید کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں

پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عاید کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ صفحہ XII)

(۱)

تین گروہ

اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (ZOISTIC) رکھتا ہے۔ اس سے اوپر (MANISTIC) کا درجہ ہے اور سب سے اوپر (DEISTIC) کا درجہ۔ اس کے بعد وہ انہی قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جس گروہ نے کنوارپن (PRE-NUPTIAL) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

(۲) جن قبائل میں زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عاید تھیں، وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے۔ اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت (CHASTITY) کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ (ص ۳۴۵-۳۰۰)

اس کے بعد ڈاکٹر انون، شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ

شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے کی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (ص ۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONOGAMY) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو، بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو۔ اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج (MODIFIED MONOGAMY) کی اصطلاح

سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعدد ازواج (ABSOLUTE POLYGAMY) ہے۔ اور

(۴) اگر مرد، دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کر لے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعدد ازواج (MODIFIED POLYGAMY) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ

آج تک کوئی قوم شق نمبر ۱ کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔ (صفحہ ۳۰)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے۔ اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِ عمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (SEXUAL ANARCHY) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۳۱)

اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی۔

بہترین تمدن کی حامل قوم

اور شادی کے بعد شق نمبر ۲ کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابلِ تنسیخ نہ ہو۔ بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہو سکتا ہو۔ یہ بعینہٖ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عاید کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے، مختلف ماہرینِ علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

جنسی تعلقات کی حد بندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (TENSION) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (COMPRESSION) پیدا ہو جاتا ہے۔ (صفحہ ۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے لئے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو، ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ

> نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود و پابندیاں عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (ص ۳۱۷)

فرائڈ کی تحقیق

بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ

> ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ ہر فرد، اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے (جب ان کی بیباکانہ تسکین ہی مقصدِ زندگی نہ بن جائے تو) یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں (جسے SUBLIMATION کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی خام توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق، اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں[1]۔

فرائڈ نے اس طریق عمل کا نام (SUBLIMATION) رکھا ہے۔ یہ علم تجزیۂ نفس (PSYCHO-ANALYSIS) کی ایک اہم اصطلاح ہے اور دورِ حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق۔ لیکن آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ انسانی ذہن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے، قرآن نے چھٹی صدی عیسوی میں [جسے عام طور پر ازمنۂ مظلمہ

---

[1] اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر میں جس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہوئے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم اس وقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہے ہیں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک نہ ہونے دیا جائے تو یہ اپنا رُخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے فرائڈ ایک بڑی حد تک بعض غلط فہمیوں کا شکار بھی ہوا ہے۔ اس کے متعلق میں نے اپنی کتاب (ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION) میں بحث کی ہے۔

(DARK - AGES) کہا جاتا ہے] کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سورۂ آلِ عمران میں مومنین کی ایک صفت الکاظمین الغیظ بتائی گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب ایک گرم اور خشک ملک ہے۔

قرآنی کظامت

جہاں پانی کی اکثر قلت رہتی ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھودتے۔ ان میں کسی میں کم پانی نکلتا کسی میں زیادہ۔ پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں (SUBTERRANEAN CHANNELS) کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے۔ اس طرح جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا، اس کا فالتو پانی دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی۔ اس طریق عمل کو ان کے ہاں کظامت کہا جاتا تھا۔ لہٰذا کاظمین الغیظ کے معنی ہوئے وہ لوگ جو اپنی اس حرارت اور توانائی کو جو غصے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے، کسی دوسری طرف منتقل کر کے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصرِ حاضر کے ماہرین تجزیۂ نفس نے (SUBLIMATION) سے تعبیر کیا ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر انون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس۔

> جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔ (ص ۳۹۸)

اضمحلال

قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَا یَزْنُوْنَ۔ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔ اس لئے کہ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا۔ (۲۵/۶۸) جو قوم ایسا کرتی ہے، اسے اِثْمٌ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں اِثْمَةٌ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے، اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس تک دورِ حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزادانہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انون نے یہ بھی کہا ہے کہ

مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائیاں پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں با عصمت ہوں اور ان کی عصمت، شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے۔ (صفحہ ۳۲۳)

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے۔ وہ حٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ (وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں) کے ساتھ وَالْحٰفِظٰتِ (۳۳/۳۵) بھی کہتا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے دامنِ عفت کو داغدار نہ ہونے دیں۔ اور جرمِ زنا کی سزا بھی مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے۔ (۲۴/۲)

قرآنی حدبندی

قرآن کی رُو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے۔ یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے، یا مرد کا کسی دوسری عورت سے جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضیٔ مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ "ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی" نہیں ہوتی بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود و حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عاید کی ہیں، باہمی رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے لہٰذا اس کا انداز سائنٹیفک ہونا چاہیئے تھا) اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع (SEXUAL OPPORTUNITISS) کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہو گی اور جہاں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے۔ وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ زنا ہے۔ نکاح کا معاہدہ اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت (LIFE-LONG COMPANIONSHIP) کا معاہدہ ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو۔ پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے، بچوں کا کھیل نہیں کہا، کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔ علاوہ بریں اس نے وحدتِ ازدواج (MONOGAMY) کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے اور تعددِ ازدواج کو محض ایک ہنگامی تمدنی

وحدتِ ازدواج

مشکل کے حل کے لئے بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (اسکی بھی محض اجازت ہے حکم نہیں) آپ دیکھیں گے کہ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONOGAMY) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے "قریب قریب" اسلئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج" میں شادی

صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے۔ لیکن قرآن نے نباہ نہ ہو سکنے کی بھی فسخ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا اور نکاح کے بعد عام حالات میں صرف ایک جوڑے کو باہمدگر وابستہ رکھتا ہے۔ تنوعِ ذوق (change) کی خاطر تبدیلی (change) کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی محصنین کے ساتھ غیر مسافحین (۵/۲۴) کا اضافہ کیا ہے جو محصن کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور سفح کے معنی ہیں یونہی بہا دینا۔ لہٰذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی مقصود ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے آئے اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف (RECOGNISED) طریق سے مہیا کئے جائیں اور ڈاکٹر اَن وِن کی تحقیق یہ ہے کہ

> انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدتِ زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو جب عقدِ نکاح مساویانہ حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا، تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اس لئے کہ اس وقت تک زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا، وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (ص ۳۸۲)

آپ نے دیکھا کہ زمانے کی علمی شہادتیں کس طرح قرآنی حقائق کی تائید کرتی چلی جا رہی ہیں اور دنیا کس طرح (غیر شعوری طور پر خود بخود) قرآن کے قریب آتی جا رہی ہے۔

(۵)

عربوں کی تاریخ

ڈاکٹر اَن وِن نے اپنی تحقیق کے دوران ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور نہیں دیتا

کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے۔ اس کے بعد جب انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کر دی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رُک گئیں۔ (ص ۱۱۹) اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک اور تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے بلکہ یہ کہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جا کر رُک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادی کی۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ اسپین میں (ص ۴۲۹)۔ کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجہ سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے "محصن" (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت / نکاح میں وحدت زوج (MONOGAMY) بطور اساسی اصول؛ اور نکاح کے بعد میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت اور مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز) لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں (جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس ہنگامی ضرورت کے بغیر جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں؛ طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ تبدیلی ازواج؛ اور قرآن کے کھلے کھلے حکم کے خلاف لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط؛ یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں) تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں اور نہ ہی اپنے تمدن کو علی حالہٖ قائم رکھنے کی صلاحیتیں باقی۔ اس قسم کی

جنسیات میں الجھی ہوئی قوم کی حالت

قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

> اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی[۲]۔ وہ واقعات

---

[۱] رابرٹ بریفا (BRIFFAULT) نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی تحقیقی اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE MOTHER) اس میں وہ ایک گروہ کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر میں گو صرف ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ (غالباً) پچیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا۔ یہ جنسی اختلاط کے متنوع مواقع کی ایک مثال ہے اس سے اور مثالوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔

[۲] دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لهم قلوب لا يفقهون بها۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

> کے اسبابِ علل (causes) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں انکی بندھی ہندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جوان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی دیوتوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت انکی سمجھ میں نہ آئے جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں، انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے حتیٰ کہ اسکی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اسکے بعد ڈاکٹر ماتون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز۔ گنڈے تعویذ۔ اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں اپنی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اسکے بعد وہ لکھتا ہے) اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں، اور جب ان کی لاشوں کو نذرِ خاک دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے۔ بالکل حیوان ہوتے ہیں[1]۔ (صفحہ ۳۴۶-۳۴۷)

آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آرہی اور کیا آج بھی ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سو آجل میں جکڑی ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جو کچھ قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ ان میں پھر نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔ ان کی ملک میں لونڈیاں آج تک سر بازار بکتی ہیں۔

ہمارا نوجوان طبقہ

یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اسکے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنہوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عاید کرنا، انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اسلئے ازمنہ مظلمہ کے ان اغلال و سلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ اس میں،

> ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے

---

[1] یہی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جہاں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام (۴۷/۱۲) وہ سامانِ زیست سے اسطرح فائدہ حاصل کرتے اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

جنسی اختلاط قائم کرے اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی ہوتی ہے نہ لڑکے پر۔ لڑکپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انہیں لذت ملتی ہو۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش بیدار ہوتی اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (ص [illegible])

اس کا نتیجہ یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے یہ اسے خود ڈاکٹر انون کی زبان سے سُن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم کی زندگی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو ریفارمر ان میں مفاہمت (COMPROMISE) کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی معاشرہ جو آئے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو بامنزور رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی (ص [illegible])

بنا بریں۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (ص [illegible])

پس چہ باید کرد؟ آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جایا جائے اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی جائے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اسکے جواب) پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہو گئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت مدید تک کم از کم حد تک محدود رکھ سکی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں

وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔ (صفحہ ۱۳۲-۱۳۱)

مرد اور عورت کی مساوی حیثیت

آپ نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا ہو۔ آج اس معاشرہ میں جس میں ہم صدیوں سے چلے آرہے ہیں' یہ کہنا کہ اسلام نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کیا تھا، شاید اپنی ہنسی اڑانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے کہ قرآن نے بہ اعلان آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کی رُو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ یعنی قانون کی نگاہ میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے تو کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اپنے معاشرے کو قرآنی خطوط پر متشکل کرلیں۔

---------- (۰) ----------

آخر میں ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک' بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن سے معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک' بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی۔ وہ تمدن وتہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ (صفحہ ۱۳۲)

قرآن ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے ہیں۔ وہ عائلی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ جہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے امور کے متعلق بالعموم اصولی قوانین دیتا ہے وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے[1]۔

لیکن اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا

---

[1] ان امور کی تفصیل میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" میں دیکھئے!

جانتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے۔ اور

ایک بنیادی حقیقت

جس طرح بھوک، پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں عام قوانین کو ڈھیلا (RELAX) کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جنسی قوانین کی بندشوں کو بھی ڈھیلا کر دینا چاہیئے۔ یہ تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (NATURAL INSTINCT) ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھو۔ تم کسی کام میں منہمک بیٹھے ہو۔ تمہیں پیاس لگتی ہے۔ شروع میں تمہیں اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو تمہیں اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر تم پانی پی لیتے ہو تو فبہا، ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور اگر تمہیں کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھوک ہے اس سے تم نے دیکھ لیا کہ

(۱) بھوک، پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ ہم اس کا خیال نہ کریں۔

خیال کا دخل

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمو دیکھ ہمارے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی اضطراری حالت کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے۔ (۲۴/۳۳)

ضبطِ نفس

اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جب تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو، اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے لئے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ وہ نہ خیالات کو طیورِ آوارہ بنائے نہ توجہ اس طرف جائے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر

اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن چور ہی کو نہیں بلکہ چور کی ماں کو بھی مارتا ہے۔ وہ صرف ارتکابِ جرم کے بعد مجرم کو نہیں پکڑتا،

بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے لئے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۔ (۶/۱۵۲) تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو۔ ان اسباب و ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آجاتے ہیں۔ اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں۔ یعنی دل میں گزرنے والے خیالات جو آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری تک سے واقف ہے۔ اس قسم کی روش کو تطہیر قلب و نگاہ کہتے ہیں۔ یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے۔ (انہیں پردے کے احکام کہا جاتا ہے)۔ مجھے افسوس ہے کہ سردست اتنا وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ قرآن کس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں عورتوں کی آزادی کو سلب نہیں کیا جاتا لیکن اس میں جنسی محرکات کبھی بے باک نہیں ہونے پاتے اور انسانی خیالات میں بے راہ روی نہیں پیدا ہوتی۔

(۷)

بہرحال، تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاط محض ایک طبعی فعل (BIOLOGICAL ACTION) نہیں جس کا تعلق صرف انسان کے جسم تک ہو۔ اس کا تعلق قوموں کی تہذیب و تمدن اور کلچر اور ثقافت کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی ہے۔ لہذا یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے یونہی نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم تمدن اور ثقافت میں ممتاز حیثیت حاصل کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنسی تعلقات کو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھیں۔ یعنی ان آزادیوں کو بھی محدود کریں جو مغرب کی اندھی تقلید سے ہمارے جدت پسند طبقہ میں دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اور ان "شرعی اجازتوں" کو بھی حدود اللہ کا پابند بنائیں جو غلط (یعنی غیر قرآنی) مذہب کی بنا پر ہمارے قدامت پسند معاشرہ میں صدیوں سے مروج چلی آرہی ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے ابھرنے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ سنت اللہ کسی کے لئے بدلا نہیں کرتی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اچھا! خدا حافظ! پرویز

——— (✻) ———

اعلان: کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی کتابیں مندرجہ ذیل مقامات سے مل سکتی ہیں۔

(۱) ہر اتوار صبح ۹ بجے تا ۱ بجے۔ سندھ اسمبلی ہال۔ (۲) محمد اسلام، بم ۱۰۰۔ لوئیس روڈ۔ بالمقابل ولیکا مل جہانگیر روڈ نیو ٹاؤن۔

(۳) گلڈزا انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ (۴) اقبال بک ہاؤس ٹرام جنکشن۔ صدر

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیم کا نصابِ نو

محترم عبدالحکیم خان مرحوم

[پروانۂ شمعِ قرآن عبدالحکیم خان نے، جن کی وفات کی اندوہ ناک خبر فروری کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے، طلوعِ اسلام کی سابقہ کنونشن میں ایک مقالہ پڑھا تھا جسے مرحوم کی آخری یادگار کے طور پر زینتِ اوراقِ طلوعِ اسلام کیا جاتا ہے۔ اس مقالہ سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ موت کے ہاتھوں ہم کس قدر گراں بہا متاع سے محروم ہو گئے ہیں۔] (طلوعِ اسلام)

پشاور میں میرے ایک چچا زاد بھائی ہیں۔ وہ ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ میں کبھی کبھی اُن سے ملنے پشاور جایا کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں جب گیا اور وقت گزارنے کے لئے اُن کی لائبریری سے کوئی کتاب اٹھانے لگا تو معاً میری نظر ایک کتاب پر پڑی جس کا نام جلی حروف میں سرورق پر "بحرالانوار" لکھا گیا تھا۔ نام کے اوپر قرآن کریم کی مشہور آیت "اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔" درج تھی اور نیچے کے حصے میں مؤلف کا نام "عبدالرؤف نوشہروی" تحریر تھا۔ یہ تینوں علامات میرے لئے وجہ کشش بنیں۔

پہلے نمبر پر کتاب کا نام "بحرالانوار" بڑا ہی جاذبِ نظر تھا۔ دوسرے نمبر پر قرآن کریم سے شوق و شغف کی وجہ سے قرآنی آیت کے مفہوم کا تجسس اور تیسرے نمبر پر "نوشہرہ" کی کشش۔ (میرا گاؤں نوشہرہ تحصیل میں ہے اور اس سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ گاؤں کی قربت کا تقاضا تھا کہ ان کے خیالات کو بھی قریب سے معلوم کروں)۔ ان تینوں عوامل نے بے اختیار میرا ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر میں "بحرالانوار" کو ہاتھ میں موجود پایا۔

کتاب پشتو میں تھی۔ جب کھولی تو معلوم ہوا کہ اس میں اولیاء کرام کے سوانح حیات، اُن کی تعلیمات اور کرامات درج ہیں۔ ان میں سب بڑے بڑے اولیاء مثلاً عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ اجمیریؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، اور پیر صاحب گولڑہؒ وغیرہم کے اسمائے گرامی موجود پائے۔ سب سے پہلا ذکر عبدالقادر جیلانیؒ کا تھا۔ میں ابھی پہلا صفحہ ہی پڑھ رہا تھا کہ بھائی صاحب سے معلوم ہوا کہ کتاب کے مؤلف کیمسٹری میں ایم۔ ایس۔ سی ہیں۔ چند سال امریکہ میں مزید ریسرچ کی غرض سے بھی گزار چکے ہیں اور اب پشاور یونیورسٹی

ہیں شعبۂ کیمسٹری کے سربراہ ہیں، مؤلف کے تعلیمی تفوق کے پیشِ نظر کتاب بڑے شوق سے پڑھنے لگا اس خیال سے کہ، اتنے بڑے عالم فاضل کی وساطت سے ان بزرگوں کی حالاتِ زندگی کے مطالعہ کا موقع مزدیک دوسرے زاویئے سے ملیگا، کیونکہ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالاتِ زندگی اس سے قبل یا تو ان کے کسی مرید کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتا تھا جس میں اُن کی زندگی کے حالات کم اور "کرامات" کا سلسلہ لامتناہی اور طویل ہوتا تھا۔ اور یا ان کے کسی مجاور کے رشحاتِ قلم ہوتے تھے جو اپنی روزی کمانے کے لئے اِن کے نام سے دوکان سجاتا اور محیّر العقول خود ساختہ "کرامات" ان کی طرف منسوب کر کے عوام پر رعب ڈالتا اور اس طرح ایک ایسے کاروبار کی بنیاد رکھ لیتا جس میں نہ سرمایہ لگانا پڑتا، نہ کاروبار کے مندا پڑجانے کا خوف اور نہ مال کے ضائع ہو جانے کا ڈر ہوتا۔ یہ تو شراب کی طرح ایسا مال ہے جس پر جتنی زیادہ مدت گزرتی جائے اتنی ہی قیمت بڑھتی جائے۔ شیطان حضرتِ انسان کو ہمیشگی کے ایک درخت اور ایک لازوال بادشاہت کا گُر بتانے لگا تھا تو قرآن کریم کے الفاظ میں یہ کہا کہ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ۔ لیکن ان اولیاء حضرات کے نبض شناس اور چالاک مجاوروں نے جس جس طرح کے گُر اور کرتب ایجاد کئے ہیں اُن تک شیطان کا دماغ بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ شیطان کے سبق میں تو مُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ تھا۔ یعنی ایسی بادشاہی جس پر زوال نہیں آسکے گا۔ لیکن یہاں تو ایسی بادشاہی ہے کہ زوال کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں، یہاں تو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہی ترقی ہے اور ہر آئندہ کل گزشتہ کل سے تابندہ اور درخشندہ ہوتی ہے۔ اگر حضرات اولیاءِ کرام اپنے ان مجاوروں کی اس سوداگری کو دیکھتے تو یقیناً چیخ اُٹھتے۔

ہمارے سوات دبنیر کے علاقے میں پیر بابا علیہ الرحمتہ کا مزار ہے۔ ان کے ایک مجاور سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ اُس ملاقات میں ذرا کھل کر باتیں ہوئیں اس نے کہا کہ پیر باباؒ کے مجاور اب تعداد میں بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور شکرانے کے پیسے بہت کم۔ اُس نے بتایا کہ سال میں میری باری صرف پانچ دن ہوتی ہے۔ پچھلے سال میری باری مارچ کے مہینے میں آئی تھی۔ اور پانچ دن کے قلیل عرصہ میں مجھے صرف سات ہزار روپے ملے۔ (ویسے مارچ اور اپریل سیزن کے مہینے ہوتے ہیں۔ زائرین سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ آتے ہیں)

تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ پروفیسر صاحب کی تالیف شدہ کتاب کو اس لئے شوق سے پڑھنے لگا کہ یقینی طور پر یہ کتاب ایسی کرامات و واقعات کا مجموعہ ہوگی جسے قرآن کی سند بھی حاصل ہوگی، اسوۂ رسولؐ کی نشاندہی بھی، اور عقلِ سلیم کے میزان میں تولے جانے کے قابل بھی ہوگی۔ لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

اس میں "نوادر" تو بہت سارے ہیں لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے فی الحال صرف دو نمونے پیش کرنے کا "ثواب" حاصل کرتا ہوں :-

(i) "عبدالقادر جیلانی ابھی رحم مادر میں تھے کہ ان کی والدہ صاحبہ ایک باغ میں گئی۔ وہاں سیب کے درخت سے سیب توڑنے لگی، ذرا اونچا تھا۔ کوشش کرنے لگی۔ ہاتھ پہنچنے والا ہی تھا کہ اس نے پیٹ میں ایسا محسوس کیا جیسے پیٹ میں کسی نے چٹکی کاٹی ہو۔ اور درد کی وجہ سے بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی کیا دیکھتی ہے کہ وہ سیب نیچے گر گیا۔ اور اس سے ایک بہت زہریلا کیڑا باہر نکل آیا۔ وہ حیران ہو گئی یہ حیرانی بدستور ان کی رہی یہاں تک کہ غوث الاعظمؒ پیدا ہو گئے۔ اور آپ چار ماہ کے ہو گئے۔ چار ماہ کے تھے۔ جھولے میں پڑے ہوئے تھے کہ والدہ صاحبہ نے پیار سے اس کے رخسار پر آہستہ سے چپت مارا۔ عبدالقادر جیلانیؒ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اماں جان آپ نے شاید مجھ سے وہ بدلہ لے لیا جبکہ میں نے آپ کو سیب کے زہریلے کیڑے سے بچانے کے لئے چٹکی کاٹی تھی۔" ص۱۷

(ii) "ایک دن غوث الاعظمؒ جا رہے تھے کہ انہیں تین خچر شراب کے مٹکوں سے لدے ہوئے راستے میں ملے۔ یہ شراب سلطان کے استعمال کے لئے تھی۔ شراب کی بدبو بہت تیز تھی۔ طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ کوتوال کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ وہ ڈر کے مارے بھاگنے لگا اور خچروں کو بھی دوڑانے لگا۔ حضرتؒ نے خچروں پر آواز کسی۔ وہ جہاں تھے وہیں دم بخود کھڑے ہو گئے۔ کوتوال وغیرہ پیٹ کے ایسے شدید درد میں مبتلا ہو گئے کہ وہیں گر پڑے۔ جب سب تڑپنے لگے اور لگے توبہ استغفار کرنے، تو حضرتؒ نے ان کے حال پر رحم کھایا۔ وہ سب اچھے اصلی حالت پر آ گئے لیکن شراب سرکہ میں بدل گئی۔" ص۲۹

یہ دو نمونے تو ہوئے اُن کرامات کے جو غوث الاعظمؒ سے پہلے کسی فرد کو ان سے نہیں نوازا گیا ہے خواہ وہ رسول ہی کیوں نہ ہو۔ اور اُن کے بعد تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ان کرامات کی فہرست میں ایک کرامت یا ولایت ایسی بھی خوش قسمتی سے شامل کی گئی ہے جو عوام سے بھی خدا کے فضل سے اکثریت کو حاصل ہوئی ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اسے کرامت کہا جائے یا کچھ اور۔ بہرحال، نوشہروی صاحب کا یہ دعوے ہے کہ "غوث الاعظمؒ کے والد کی عمر ساٹھ سال تھی۔ تجربہ اور حکمت کی

رُو سے اس عمر میں پیدائش کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن انبیاء اور اولیاء اس کلیہ سے مستثنےٰ ہوتے ہیں۔ غوث الاعظمؒ کی پیدائش بھی ایک کرامت تھی۔" ص ۱۴

اس کرامت میں نوشہروی صاحب نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے اور اس کرامت کے حلقے میں نادانستہ طور پر عوام بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ورنہ کہاں عوام اور کہاں کرامات۔

اتنی ڈگریاں اور سندیں حاصل کرنے اور امریکہ میں کئی سال رہنے کے بعد جناب نوشہروی کو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ مرد کے جرثومہ حیات ہرگز ختم نہیں ہوتے ہیں خواہ اس کی عمر ایک سو پچاس سال تک کیوں نہ پہنچ جائے۔ میں نے ان کو لکھا ہے کہ ایسی کرامتیں تو روزانہ ظہور میں آتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں آتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کرامت کا اعزاز نہ صرف مسلمانوں کو حاصل ہے بلکہ انگریز، روسی، ہندو، سکھ، سب اس سے مساوی نوازے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ غوث الاعظمؒ کی کرامت کا پَرتو ہے یا اور کوئی چیز ہے۔

جب اس قسم کی مضحکہ خیز اور عقل سوز کرامات اس "بحر الانوار" میں میری نظر سے گذریں تو بھائی صاحب پر بڑا خفا ہوا کہ بایں عقل و دانش انہوں نے اس کتاب کو اپنی لائبریری میں کیونکر جگہ دی ہے۔ کہنے لگے کہ لڑکی پشتو بائی پر افیشینسی میں امتحان دے رہی ہے۔ یہ کتاب اس کے کورس میں شامل ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ پروفیسر صاحب کے حق میں سوائے اسکے اور کیا کہا جائے کہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا ۔ کارِ طفلاں خراب خواہد شد

میں نے اس کتاب پر تفصیلی مراسلہ لکھا ہے اور پروفیسر صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے۔ دیکھئے آپ جواب میں کیا لکھتے ہیں۔ میں یہ مراسلہ مرتب کر رہا تھا کہ ادارہ کی طرف سے خط آیا کہ میں متوقع "طلوعِ اسلام کالج" کے بارے میں ایک مختصر مقالہ کنونشن کے موقع پر پیش کروں۔ اس خط میں اشارۃً کہا گیا ہے کہ مقالے کا محور مندرجہ ذیل دو سوالات ہوں۔

(۱) کالج کی اہمیت۔
(۲) کالج کے قیام کے لئے عملی تجاویز۔

(۱) کالج کی اہمیت کا اندازہ تو آپ نے میرے ان تمہیدی سطور سے لگا لیا ہوگا — آپ نے دیکھا کہ ہمارے بچوں کے تعلیمی نصاب کس طرح فرسودہ و بے بنیاد کہانیوں اور عقل سوز افسانوں پر مشتمل ہیں اور پھر اس دور میں جب انسان چاند پر محوِ خرام نظر آ رہا ہے۔ ایک طرف تو اسی امریکہ کے انسان نے ایک صحیح نصاب کی راہنمائی میں اپنے ذہن کو جلا بخشا ہے اور چاند کے سینے میں اپنا قومی جھنڈا گاڑ کر لِمَنِ الْمُلْکُ کا اعلان

کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ دوسری طرف اسی امریکہ کے ایک فارغ التحصیل یعنی ہمارے زیرِ بحث دانشور صاحب نے غلط نصاب کی وجہ سے اپنے ذہن کو جلا ڈالا ہے اور زمین میں دھسا جا رہا ہے۔ خود تو یہ دھسا جا رہا اور ڈوبا جا رہا ہے، لیکن ڈوبتے ڈوبتے ہماری آئندہ نسل کو بھی ڈوبنے کا اعزاز بخش رہا ہے اور بزبانِ حال و قال کہہ رہا ہے۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

زیادہ افسوس تو اس بات پر ہے کہ اتنا زیادہ قومی نقصان پہنچانے اور نئی نسل کو تباہ و برباد کرنے کے بعد اپنے اس کارنامے پر نہ نادم ہے اور نہ اسے احساسِ زیاں ہے بلکہ فخریہ انداز میں "عرضِ حال" کے عنوان سے اس کتاب میں یوں رقمطراز ہے۔

> ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا۔ میں لاہور میں طالب علم تھا۔ سردار عبدالرب نشتر اس وقت وہاں گورنر تھے۔ ایک دن لاہور قلعہ کی درکشائی کی رسم منائی گئی۔ نشتر صاحب نے افتتاح کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا کہ قیامت کے دن جب میں اللہ کے دربار میں پیش ہونگا اور اللہ تبارک و تعالیٰ مجھ سے اعمال کے بارے میں پوچھیگا تو میں جواب میں کہوں گا کہ اور تو کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے البتہ اتنا یاد ہے کہ ایک دن ایک نیک کام کیا تھا اور وہ یہ کہ بزرگوں کے ہاتھوں کا لاہور شاہی قلعے کا دروازہ جو مدت بعید سے بند پڑا تھا درکشائی کی تھی، تاکہ مخلوقِ خدا آزادی کے ساتھ اس میں آ اور جا سکے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کی وجہ سے بخشے۔ یہی حال میرا بھی ہے، مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب میری بخشش کا سبب بنے گی ۰

—— کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا —— اسی کو کہتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ صاحب قوم کے بچوں کو تباہی اور دوزخ کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے اور دوسری طرف اللہ میاں سے بخشش کی قوی آس بھی لگائے بیٹھا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ اس نے اپنے لئے نمونہ نشتر مرحوم کو بنایا ہے۔ اگر نشتر مرحوم گورنر کی حیثیت سے حکم دے کر اور مزدوروں سے دروازہ کھلوا کر جنت کا مستحق ٹھہر سکتے ہیں جس میں نہ "ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، رنگ چوکھا آئے" تو ہمارے نوشہروی صاحب پوری ایک کتاب نقل کرنے کے بعد کیونکر جنت کا دعویدار نہیں بن سکتا ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوگی کہ نوشہروی صاحب نے کتاب کے آخر میں کتابوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے جن سے انہوں نے اپنی کتاب مرتب کی ہے۔ اور جب میں ان کتابوں کو گننے لگا تو یہ گنتی انتیس تک پہنچ گئی۔ یہ کتاب —— انتیس[۲۹] کتابوں

کا نچوڑ ــــ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔

ایک جنت تو وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ قرآن میں کرتا ہے اور اس کا استحقاق کا مرحلہ بڑے صبر آزما قربانیوں کے بعد آتا ہے۔ جیسے قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ

تم جنت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے ہو جب تک تم پر بھی وہ مصائب اور تکالیف نہ آئیں جو تم سے قبل تمہارے آباؤ اجداد پر اللہ کی راہ میں آئی تھیں۔ وہ آلام و مصائب سے لرزنے لگے حتیٰ کہ رسول اور مومنین پکار اٹھے کہ یا الٰہ العالمین تیری مدد کب آئے گی؟

اور پھر ایک جنت نشتر مرحوم اور نوشہروی صاحب کے اذہان کی تعمیر شدہ ہے اور وہ دونوں نومیت کے جنتوں پر علامہ اقبالؒ نے جس خوبی سے روشنی ڈالی ہے وہ بھی سماعت فرمایئے۔

بہشتے بہر ارباب ہمم است — بہشتے بہر پاکان حرم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش — بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

یہ تو ہوئے ان کے وہ خوش آیند تو قعات اور خوش فہمیاں جن کی بنیادوں پر انہوں نے بہشت فی سبیل اللہ کھڑی کی ہے۔ لیکن اس موقع پر ایک دوسرے دانشور جن کو اس کتاب کا تعارف لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے، مختصر طور پر ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ان صاحب کا اسم گرامی (مولانا) عبدالقادرؒ ہے۔ ایم۔اے ہیں۔ بڑے عالم، فاضل مشہور ہیں۔ بڑے اہم علمی محکموں سے متعلق رہے ہیں۔ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے کافی مدت تک ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ ہزاروں روپے تنخواہ لیتے رہے ہیں۔ ابھی پچھلے سال ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ان کے ملفوظات بھی سنیئے۔ اس نادر اور بے مثل کتاب پر کس دریا دلی سے جناب مؤلف کو داد دے رہے ہیں۔

جن اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کے حالات فاضل مؤلف جناب عبدالرؤف نے اس کتاب میں بیان کئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ یہ ہر قاری کے لئے آج بھی رشد و ہدایت کی باعث ہونگے۔ فاضل مصنف علم کیمیا کے پروفیسر ہیں اور پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ کیمیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ کہاں سائنس، پھر سائنس میں علم کیمیا اور پھر کہاں

تصوف، لیکن یہ اللہ کا فضل ہے جس پر ہو جائے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ۔"

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جس کسی نے ناجائز کمائی سے کوئی بلڈنگ وغیرہ تعمیر کر لی ہو تو اس کے ماتھے پر هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ یا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ لکھا ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آیت کے اس ٹکڑے سے یہ صاحب بتانا یہ چاہتا ہے کہ اگر مجھے اپنی محنت، اہلیت اور قابلیت کے لحاظ سے بدلہ ملتا تو یہ مکان ہرگز تعمیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو خدا بھلا کرے رشوت، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ کا، کہ ایک رات میں میری دنیا بدل گئی۔ اسی طرح مولانا عبدالقادر صاحب کے جناب عبدالرؤف نوشہروی کے حق میں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ لکھنا غالباً یہی ظاہر کرتا ہے کہ نوشہروی صاحب نے جو امتحانات پاس کئے ہیں یا جو ڈگریاں حاصل کی ہیں، بطور استحقاق نہیں ہیں بلکہ "من فضل ربی" ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ ورنہ بات ظاہر ہے۔ کتاب کے اقتباسات آپ کے سامنے آئے ہیں۔ اس میں جو کچھ نمونۃً پیش کیا گیا ہے اسے مولانا عبدالقادر فضل اللہ یعنی اللہ کا فضل کہتے ہیں۔ اگر اسے اللہ کا فضل کہا جائے تو معلوم نہیں اللہ کا قہر اور غضب کسے کہنا پڑے گا۔

اس مقالے میں اگر کتاب کے "عرضِ حال" اور "تعارف" کے عنوانات کو زیرِ بحث لانے کے بعد ایک تیسرے عنوان "انتساب" کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے تو یہ نہ صرف اس مقالے کے ساتھ بے انصافی ہوگی بلکہ زیرِ بحث تصنیف بھی گلہ کرے گی۔ جناب نوشہروی صاحب اس کتاب یا صواب کو اپنے بچوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے، اسے مادیت کے اس دور میں اُن کے لئے روحانیت کا حصار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بابت وہ "انتساب" کے زیرِ عنوان یوں لکھتے ہیں۔

"میں اپنے بچوں ـــ جاوید، طاہرہ، ظفر، ناصرہ اور عطیہ کے نام منسوب کرتا ہوں تاکہ آج کے مادی دور میں جبکہ لوگ روحانیت سے دور بھاگ رہے ہیں، ان کی زندگی روحانیت کی چار دیواری میں گزرے۔

میں ڈرتا ہوں کہ یہ سیلاب کہیں میرا یہ سرمایہ اپنے ساتھ بہا نہ لے جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی راہ نمائی ان کو اس سیلاب سے بچائے رکھے۔"

پشاور یونیورسٹی کے دو بلند پایہ عالموں کے خیالات سے آپ روشناس ہو گئے۔ اگر اتنے بڑے بڑے عالم، اتنی بڑی بڑی ڈگریوں کے حصول کے بعد بھی صحیح تربیت اور صحیح نصابِ تعلیم کے فقدان سے نہ تو مردِ مومن کی نگاہ پیدا کر سکتے ہوں اور نہ دانائے راز کا دل، تو لامحالہ وقت آگیا ہے کہ ہم "قرآنی کالج"

کی بنیاد رکھیں اور مخصوص نصاب کے تحت قرآن کی روشنی میں اپنی نئی پود کو ایک بار پھر پکاریں کہ ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

لیکن بدقسمتی سے اگر ہم نے اب بھی قرآن کی تعلیمات کے مطابق اپنے اس قرآنی کالج کے قیام کو نظر انداز کیا اور اس کے لئے جدوجہد میں کوتاہی سے کام لیا تو ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کے لئے قبر کھود رہے ہیں اور کل جب اللہ تعالےٰ کے دربار میں ہمارے سامنے ہماری اولاد کھڑی کی جائے گی، تو ہمارے پاس کیا جواب ہوگا جب اللہ میاں پوچھیگا۔ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ؟ — میدانِ حشر کی اس ندامت اور خجالت سے اگر ہمیں کوئی چیز بچا سکتی ہے تو یہ صرف قرآنی کالج ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ (د) اب رہی عملی تجاویز۔ اس کے بارے میں گزارش ہے کہ ہر بزم ایک خاص رقم اپنی استطاعت کے مطابق پورے خلوص اور دیانت سے کنونشن میں سالانہ ادا کرنے کا اعلان کرے اور اسے اگلی کنونشن سے قبل ادا کرنے کا عہد کرے۔ یہ عہد ایسا ہو کہ زمین پھٹ جائے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے مگر اس میں کسی قسم کی کمزوری نہ آنے پائے۔

(ب) ایک ایک روپے کے ٹکٹ بکٹ جو اس مقصد کے لئے چھپوائے گئے ہیں، جاری رکھے جائیں۔ اس کے نتائج مفید نکل رہے ہیں۔

(ج) ہاں ایک بات جو میرے خیال میں بہت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ جس جس طرح ہماری بزموں کے پاس رقم پہنچتی رہے، ساتھ کے ساتھ ادارے کو بھیجی جائے تاکہ تعمیری کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہونے پائے۔ اس طرح رقمیں ادارے کو پہنچتی جائیں گی اور کرے بنتے جائیں گے۔ انشاء اللہ چند سالوں میں کمرے ہی کمرے نظر آئینگے۔ ہم جو بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور ان کے دیو ہیکل عمارات آج دیکھ رہے ہیں، یہ ایک دن یا ایک سال میں نہیں بنی ہیں بلکہ سالہا سال کی سعی و کاوش اور ایثار و قربانی کا نتیجہ ہیں۔ علی گڑھ اور پشاور یونیورسٹیاں ایک لمبی مدت میں اس مقام تک پہنچی ہیں۔ اگر ہماری کوششیں ایسی جاری رہیں اور ہماری ہمتیں ہمت مرداں کے کارنامے دکھاتی رہیں تو، قرآنی کالج، انشاء اللہ اسی شان و شوکت سے ہمارے عزیز نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بنے گا جو کسی زمانہ میں عزناطہ اور قرطبہ سنبھالا کرتے تھے۔ قرآنی تعلیمات کے چشمے جاری ہو جائینگے اور ہم مسلمان قرآن کی حقانیت پر ایمان رکھنے والے ایک دفعہ پھر کہہ سکینگے کہ

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ط
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝